# مشمولات


- **عرضِ احوال** ——— 3

  فَاعْتَبِرُوْا یَااُولِی الْاَبْصَارِ!

  ایوب بیگ مرزا

- **بیانُ القرآن** ——— 5

  سورۃ الانعام (آیات ۲۱ تا ۵۰)

  ڈاکٹر اسرار احمد

- **اسلام کا نظامِ حیات** ——— 21

  اسلام کا معاشی اور اقتصادی نظام

  ڈاکٹر اسرار احمد

- **تعمیرِ سیرت** ——— 69

  شیطان اور اس کی چالیں

  عتیق الرحمٰن صدیقی

- **تذکیر و موعظت** ——— 79

  اہل سنت والجماعت کون؟

  پروفیسر محمد یونس جنجوعہ

- **نقد و نظر** ——— 85

  تحریک تجدد اور متجددین (۲)

  حافظ محمد زبیر


❁ ❁ ❁

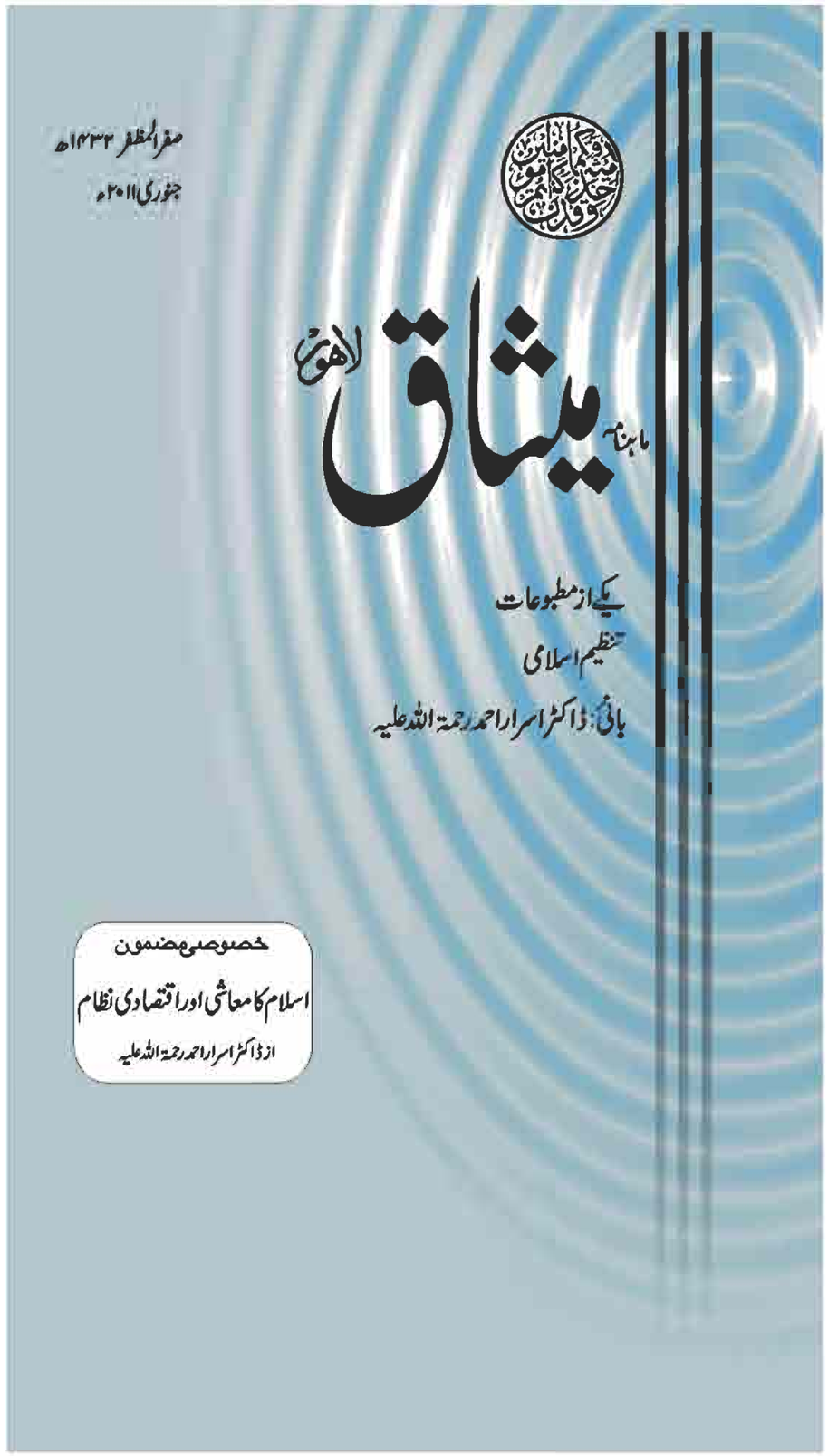

وَاذْكُرُوا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَمِيْثَاقَهُ الَّذِيْ وَاثَقَكُمْ بِهٖٓ ۙ اِذْ قُلْتُمْ سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا ۡ (المائدۃ:۷)

ترجمہ: اور اپنے اوپر اللہ کے فضل اور اس کے میثاق کو یاد رکھو جو اس نے تم سے لیا جبکہ تم نے اقرار کیا کہ ہم نے مانا اور اطاعت کی!


جلد : 60

شمارہ : 1

صفر المظفر 1432ھ

جنوری 2011ء

فی شمارہ 25/-


# ماہنامہ میثاق لاہور

اجرائے ثانی

ڈاکٹر اسرار احمد رحمۃ اللہ علیہ


مدیر
حافظ عاکف سعید

نائب مدیر
حافظ خالد محمود خضر


## سالانہ زرِتعاون

| | |
|---|---|
| ❁ اندرون ملک | 250 روپے |
| ❁ بھارت وبنگلہ دیش | 900 روپے |
| ❁ ایشیا، یورپ، افریقہ وغیرہ | 1200 روپے |
| ❁ امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا وغیرہ | 1500 روپے |

ترسیل زر: مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور


مکتبہ خدام القرآن لاہور

مقام اشاعت: 36۔ کے ماڈل ٹاؤن لاہور 54700 ' فون: 3-35869501

فیکس: 35834000 ای میل: publications@tanzeem.org

ویب سائٹ ایڈریس: www.tanzeem.org

مرکزی دفتر تنظیم اسلامی: 67۔ علامہ اقبال روڈ، گڑھی شاہو لاہور

فون: 36366638 - 36316638 فیکس: 36271241

پبلشر: ناظم مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

طابع: رشید احمد چوہدری مطبع: مکتبہ جدید پریس (پرائیویٹ) لمیٹڈ

# فَاعْتَبِرُوْا یَااُولِی الْاَبْصَارِ!!

نائن الیون سے پہلے پرویز مشرف کا امیج ایک بہادر کمانڈو صدر اور ایک ڈٹ جانے والے شخص کا امیج تھا۔ بھارت کے دورے کے دوران اُس نے جو رویہ اختیار کیا تھا' خصوصاً کشمیر کے حوالہ سے اُس نے جو اصولی موقف اختیار کر کے مشترکہ اعلامیہ کو مسترد کر دیا تھا' اس پر اُس نے عوامی حلقوں سے بڑی داد وصول کی تھی' لیکن اس کی بہادری اور اصول پسندی ٹوئن ٹاورز کے ملبے تلے دفن ہوگئی۔ بعدازاں اُس نے نہ صرف بزدلی اور بے اصولی بلکہ بے حمیتی اور بے غیرتی کا مظاہرہ کیا اور امریکہ کے سامنے جس طرح وہ بچھ گیا اور امریکی احکامات کی جس طرح بے چون و چرا تعمیل کی یہ ایک طویل داستان ہے جو بار بار دہرائی جا چکی ہے۔ اس نے غلامی کا یہ پٹہ اپنے اقتدار کو طول دینے کے لیے گلے میں ڈالا تھا' لیکن انجام کیا ہوا' جب عوامی مخالفت کا ریلا آیا تو امریکہ نے اس کے سیاسی مخالفین کی پیٹھ ٹھونکی اور اسے ذلیل و رسوا کر کے اقتدار سے نکال باہر کیا۔ آج حالت یہ ہے کہ وہ پاکستان میں داخل ہونے سے خوفزدہ ہے اور ایک ایسے مسافر کی طرح بھٹک رہا ہے جس کی نہ کوئی منزل ہو اور نہ کوئی دیس۔ شومئی قسمت کہ ہمارا حکمران طبقہ' وہ سیاسی ہو یا فوجی' عبرت پکڑنے اور سبق سیکھنے کو تیار نہیں۔ ۲۰۰۸ء کے انتخابات کے نتیجے میں جو حکمران بنے انہوں نے پرویز مشرف کو تو نکال باہر کیا لیکن اس کی پالیسیوں اور غلامانہ طرزِ عمل کا تسلسل اسی شدّومدّ سے جاری رکھا۔ نئے سیاسی حکمرانوں نے یہ تجزیہ کرنا ضروری ہی نہ سمجھا کہ پرویز مشرف کیوں ناکام اور ذلیل و خوار ہوا اور نہ یہ جاننا ضروری سمجھا کہ آنکھیں بند کر کے امریکیوں کی فرمانبرداری سے پاکستان نے کیا کھویا اور کیا پایا ہے' دہشت گردی سے پاک سرزمین کیوں سرخ ہوتی جا رہی ہے' پاکستان عالمی سطح پر عزت و وقار کیوں کھو بیٹھا ہے' پاکستان میں امن و امان کیوں تہ و بالا ہوا اور یہاں لاقانونیت کیوں عروج پر ہے؟

نائن الیون کے بعد افغانستان اور پاکستان نے متضاد اور مخالف سمت میں پالیسیاں اختیار کیں۔ افغان طالبان نے ملا عمر کی قیادت میں اپنی غربت' پسماندگی اور انتہائی بے سروسامانی کے باوجود سپریم قوت امریکہ کے سامنے ڈٹ جانے کا فیصلہ کیا' جبکہ ایٹمی قوت کے حامل پاکستان نے امریکہ کے آگے سرنڈر کرنے کا فیصلہ کیا اور اپنے برادر اسلامی ہمسایہ ملک کے خلاف امریکی جارحیت کا ساتھ دینے اور اس کا اتحادی بننے پر رضامند ہوگیا۔ لیکن ہمارے اس اتحادی نے بڑی عیاری اور مکّاری سے اس جنگ کو ہمارے آنگن تک پہنچا دیا ہے۔ اب مسلمان باہم جنگ و جدال کر رہے ہیں اور ایک دوسرے کا خون بہا رہے ہیں۔ یہ جنگ آگ کی صورت اختیار کر کے ہمارے گھروں کو جلا کر خاکستر کر رہی ہے۔ اے کاش! اس جنگ کو اگر ہمارے گھروں تک پہنچنا ہی تھا اور ہمارا خون اسی سرزمین میں جذب ہونا ہی تھا تو ہم عالمِ کفر کے خلاف اپنے برادر اسلامی ملک کے شانہ بشانہ لڑتے ہوئے اور دشمنانِ اسلام کے خلاف سینہ سپر ہوتے ہوئے اپنے خون سے پاک سرزمین کو رنگین کرتے۔ دنیوی طور پر بھی کوئی عقلی دلیل کوئی منطق سمجھ آتی کہ ہم لہولہان اس لیے ہوئے ہیں کہ مسلمانوں کے دشمن اور اللہ اور رسول کے دشمن نے جس الزام کی بنیاد پر ہمارے بھائیوں پر جنگ مسلّط کی ہے وہ اس الزام کو کسی عدالت کے کٹہرے میں کسی فورم پر ثابت نہیں کر سکا۔ کسی بین الاقوامی عدالت یا غیر جانبدار فورم پر الزام ثابت کرنا تو درکنار وہ اپنے ملک کی کسی عدالت میں بھی الزام ثابت نہیں کر سکا۔ لہٰذا کمزور ہونے کے باوجود دینی اخلاقی اور انسانی ہمدردی کی بنیاد پر ہمارا فرض ہے کہ اپنے مظلوم اور معصوم بھائیوں کے دفاع میں جان و مال کا نذرانہ پیش کر دیں۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے جس طرح افغان طالبان کی مدد کی یقیناً ہماری بھی کرتا اور ہم آخرت میں بھی سرخرو ہوتے۔ بہرحال ہم پر اللہ کی بجائے امریکہ کا خوف طاری ہوگیا اور ہم امریکہ کے اتحادی بن گئے۔ آج نتائج سامنے ہیں' ہمارا انگ انگ زخمی ہے' فاٹا اور قبائلی علاقے کے لوگ پاکستان کی فوج اور حساس اداروں کو اپنا دشمن سمجھنے لگے ہیں۔ پاکستان مالی طور پر دیوالیہ ہوگیا ہے۔ ڈرون حملوں نے پاکستانی حکومت کی رِٹ اور ہماری خودمختاری کو تار تار کر دیا ہے اور جس امریکہ کی خاطر ہمارا یہ حشر ہوا وہ ہم پر طرح طرح کے الزامات لگا رہا ہے اور نوبت یہاں تک پہنچ گئی ہے کہ جن حساس اداروں نے امریکی خواہشات کی تکمیل میں ان کے اتحادی بن کر عوام سے خلیج پیدا کی ان ہی اداروں کے سربراہ کو آج امریکی ملزم قرار دے کر اپنی عدالتوں میں طلب کر رہے ہیں۔ کیا جس امریکہ نے مشرف جیسے وفادار اور پالتو سے آنکھیں پھیر لی ہیں وہ آصف زرداری سے وفا کرے گا؟ چاہے آصف زرداری امریکہ کے لیے زمین و آسمان ایک کر دیں' چاہے فوج اپنے سپوتوں کی مزید جانیں قربان کر دے۔ یہود و نصاریٰ کبھی مسلمانوں کے دوست ثابت نہیں ہوں گے' یہ ایک دوسرے کے دوست ہیں۔ یہ کسی مفکّر یا عالم کا نہیں ربِ کائنات کا فیصلہ ہے' جو کبھی غلط نہیں ہوسکتا۔ اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ ہمارے حکمرانوں کو کیا ہوگیا ہے' وہ تاریخ پر نگاہ کیوں نہیں ڈالتے' وہ نوشتۂ دیوار

(باقی صفحہ 68 پر)

دورۂ ترجمۂ قرآن

ڈاکٹر اسرار احمد

# سُورۃُ الانعام

## آیات ۲۱ تا ۳۰

وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰی عَلَی اللّٰهِ كَذِبًا اَوْ كَذَّبَ بِاٰيٰتِهٖ ؕ اِنَّهٗ لَا يُفْلِحُ
الظّٰلِمُوْنَ ﴿۲۱﴾ وَيَوْمَ نَحْشُرُهُمْ جَمِيْعًا ثُمَّ نَقُوْلُ لِلَّذِيْنَ اَشْرَكُوْٓا اَيْنَ
شُرَكَآؤُكُمُ الَّذِيْنَ كُنْتُمْ تَزْعُمُوْنَ ﴿۲۲﴾ ثُمَّ لَمْ تَكُنْ فِتْنَتُهُمْ اِلَّآ اَنْ قَالُوْا
وَاللّٰهِ رَبِّنَا مَا كُنَّا مُشْرِكِيْنَ ﴿۲۳﴾ اُنْظُرْ كَيْفَ كَذَبُوْا عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ وَضَلَّ
عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَفْتَرُوْنَ ﴿۲۴﴾ وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّسْتَمِعُ اِلَيْكَ ۚ وَجَعَلْنَا عَلٰى
قُلُوْبِهِمْ اَكِنَّةً اَنْ يَّفْقَهُوْهُ وَفِيْٓ اٰذَانِهِمْ وَقْرًا ؕ وَاِنْ يَّرَوْا كُلَّ اٰيَةٍ لَّا
يُؤْمِنُوْا بِهَا ؕ حَتّٰٓى اِذَا جَآءُوْكَ يُجَادِلُوْنَكَ يَقُوْلُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اِنْ
هٰذَآ اِلَّآ اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ ﴿۲۵﴾ وَهُمْ يَنْهَوْنَ عَنْهُ وَيَنْـَٔوْنَ عَنْهُ ۚ وَاِنْ
يُّهْلِكُوْنَ اِلَّآ اَنْفُسَهُمْ وَمَا يَشْعُرُوْنَ ﴿۲۶﴾ وَلَوْ تَرٰٓى اِذْ وُقِفُوْا عَلَى النَّارِ
فَقَالُوْا يٰلَيْتَنَا نُرَدُّ وَلَا نُكَذِّبَ بِاٰيٰتِ رَبِّنَا وَنَكُوْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۲۷﴾ بَلْ
بَدَا لَهُمْ مَّا كَانُوْا يُخْفُوْنَ مِنْ قَبْلُ ؕ وَلَوْ رُدُّوْا لَعَادُوْا لِمَا نُهُوْا عَنْهُ
وَاِنَّهُمْ لَكٰذِبُوْنَ ﴿۲۸﴾ وَقَالُوْٓا اِنْ هِيَ اِلَّا حَيَاتُنَا الدُّنْيَا وَمَا نَحْنُ
بِمَبْعُوْثِيْنَ ﴿۲۹﴾ وَلَوْ تَرٰٓى اِذْ وُقِفُوْا عَلٰى رَبِّهِمْ ؕ قَالَ اَلَيْسَ هٰذَا بِالْحَقِّ ؕ
قَالُوْا بَلٰى وَرَبِّنَا ؕ قَالَ فَذُوْقُوا الْعَذَابَ بِمَا كُنْتُمْ تَكْفُرُوْنَ ﴿۳۰﴾



**آیت ۲۱** ﴿وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰی عَلَی اللّٰهِ كَذِبًا اَوْ كَذَّبَ بِاٰيٰتِهٖ ؕ اِنَّهٗ لَا يُفْلِحُ
الظّٰلِمُوْنَ ﴿۲۱﴾﴾ ''اور اُس سے بڑھ کر ظالم کون ہوگا جس نے اللہ پر کوئی جھوٹی تہمت لگائی یا اُس کی آیات کو جھٹلایا۔ یقیناً ایسے ظالم (کبھی) فلاح نہیں پا سکتے۔''

یعنی یہ دو عظیم ترین جرائم ہیں جو شناعت میں برابر کے ہیں' اللہ کی آیات کو جھٹلانا یا کوئی شے خود گھڑ کر اللہ کی طرف منسوب کر دینا۔

**آیت ۲۲** ﴿وَيَوْمَ نَحْشُرُهُمْ جَمِيْعًا ثُمَّ نَقُوْلُ لِلَّذِيْنَ اَشْرَكُوْٓا اَيْنَ شُرَكَآؤُكُمُ
الَّذِيْنَ كُنْتُمْ تَزْعُمُوْنَ ﴿۲۲﴾﴾ ''اور جس دن ہم جمع کریں گے ان سب کو پھر کہیں گے ان سے جنہوں نے شرک کیا تھا کہاں ہیں تمہارے وہ شرکاء جن کا تمہیں گھمنڈ ہو گیا تھا؟''

تمہارا گمان تھا کہ وہ تمہیں ہماری پکڑ سے بچا لیں گے۔

**آیت ۲۳** ﴿ثُمَّ لَمْ تَكُنْ فِتْنَتُهُمْ اِلَّآ اَنْ قَالُوْا وَاللّٰهِ رَبِّنَا مَا كُنَّا مُشْرِكِيْنَ ﴿۲۳﴾﴾ ''پھر نہیں ہوگی ان کی کوئی اور چال سوائے اس کے کہ وہ کہیں گے کہ اللہ کی قسم جو ہمارا ربّ ہے ہم مشرک نہیں تھے۔''

**آیت ۲۴** ﴿اُنْظُرْ كَيْفَ كَذَبُوْا عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ وَضَلَّ عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَفْتَرُوْنَ ﴿۲۴﴾﴾
''دیکھو کیسے وہ جھوٹ بولیں گے اپنے اوپر اور جو افترا انہوں نے کیا ہوا تھا وہ سب ان سے گم ہو جائے گا۔''

ان کے یہ دعوے کہ فلاں دیوی بچائے گی اور فلاں دیوتا سفارش کرے گا' سب نسیاً منسیاً ہو جائیں گے۔ عذاب کو دیکھ کر اس وقت ان کے ہاتھوں کے طوطے اُڑ جائیں گے۔

**آیت ۲۵** ﴿وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّسْتَمِعُ اِلَيْكَ ۚ﴾ ''اور (اے نبی ﷺ) ان میں سے کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو آپ کی بات کو بڑی توجہ سے سنتے ہیں۔''

مکّہ میں قریش کے سرداروں کے لیے جب عوام کو ایمان لانے سے روکنا مشکل ہو گیا تو انہوں نے بھی علماءِ یہود کی طرح ایک ترکیب نکالی۔ وہ بڑے اہتمام کے ساتھ آ کر حضور ﷺ کی مجلس میں بیٹھتے اور بڑے انہماک سے کان لگا کر آپؐ کی باتیں سنتے۔ وہ یہ ظاہر کرتے تھے کہ ہم سب کچھ بڑی توجہ سے سن رہے ہیں' تاکہ عام لوگ دیکھ کر یہ سمجھیں کہ واقعی ہمارے ذی فہم سردار یہ باتیں سننے' سمجھنے اور ماننے میں سنجیدہ ہیں' مگر پھر بعد میں عوام میں آ کر ان باتوں کو ردّ

کر دیتے۔ عام لوگوں کو دھوکہ دینے کے لیے یہ ان کی ایک چال تھی' تا کہ عوام یہ سمجھیں کہ ہمارے یہ سردار سمجھدار اور ذہین ہیں' یہ لوگ شوق سے محمد (ﷺ) کی محفل میں جاتے ہیں اور پورے انہماک سے ان کی باتیں سنتے ہیں' پھر اگر یہ لوگ اس دعوت کو سننے اور سمجھنے کے بعد ردّ کر رہے ہیں تو آخر اس کی کوئی علمی اور عقلی وجوہات تو ہوں گی۔ لہٰذا آیت زیر نظر میں ان کی اس سازش کا تذکرہ کرتے ہوئے فرمایا گیا کہ اے نبی (ﷺ) ان میں سے کچھ لوگ آپ کے پاس آتے ہیں اور آپ کی باتیں بظاہر بڑی توجہ سے کان لگا کر سنتے ہیں۔

﴿وَجَعَلْنَا عَلٰى قُلُوْبِهِمْ اَكِنَّةً اَنْ يَّفْقَهُوْهُ وَفِيْٓ اٰذَانِهِمْ وَقْرًا ؕ وَاِنْ يَّرَوْا كُلَّ اٰيَةٍ لَّا يُؤْمِنُوْا بِهَا ؕ﴾ ''حالانکہ ہم نے ان کے دلوں پر پردے ڈال دیے ہیں کہ وہ ان کو سمجھ نہیں سکتے اور ان کے کانوں کے اندر ہم نے ثقل پیدا کر دیا ہے۔ اور اگر یہ ساری نشانیاں (جو یہ مانگ رہے ہیں) بھی دیکھ لیں تب بھی ان پر ایمان نہیں لائیں گے۔''

اللہ نے ان کے دلوں اور دماغوں پر یہ پردے کیوں ڈال دیے؟ یہ سب کچھ اللہ کی اس سنّت کے مطابق ہے کہ جب نبی کے مخاطبین اس کی دعوت کے مقابلے میں حسد' تکبّر اور تعصّب دکھاتے ہوئے اپنی ضد پر اڑے رہتے ہیں تو ان کی سوچنے اور سمجھنے کی صلاحیتیں سلب کر لی جاتی ہیں۔ جیسے سورۃ البقرۃ (آیت ۷) میں فرمایا گیا: ﴿خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ وَعَلٰى سَمْعِهِمْ ؕ وَعَلٰٓى اَبْصَارِهِمْ غِشَاوَةٌ ۫﴾۔ لہٰذا ان کا بظاہر توجہ سے نبی ﷺ کی باتوں کو سننا ان کے لیے مفید نہیں ہوگا۔

﴿حَتّٰٓى اِذَا جَآءُوْكَ يُجَادِلُوْنَكَ يَقُوْلُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اِنْ هٰذَآ اِلَّآ اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ ﴿۲۵﴾﴾ ''یہاں تک کہ (اے نبی ﷺ) جب وہ آپ کے پاس آتے ہیں تو آپ سے جھگڑا (اور مناظرہ) کرتے ہیں (اور) کافر کہتے ہیں کہ یہ (قرآن جو آپ سنا رہے ہیں) کچھ بھی نہیں صرف پہلے لوگوں کی کہانیاں ہیں۔''

یہ جو کچھ آپ (ﷺ) ہمیں سنا رہے ہیں یہ پرانی باتیں اور پرانے قصّے ہیں' جو معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے یہودیوں اور نصرانیوں سے سن رکھے ہیں۔

**آیت ۲۶** ﴿وَهُمْ يَنْهَوْنَ عَنْهُ وَيَنْـَٔوْنَ عَنْهُ ۚ﴾ ''اور وہ اس سے روکتے بھی ہیں اور خود بھی رُک جاتے ہیں۔''

یہاں آپس میں ملتے جلتے دو افعال استعمال ہوئے ہیں' ایک کا مادہ 'ن ھ ی' ہے اور



دوسرے کا 'ن ء ی' ہے۔ نَھٰی یَنْھٰی (روکنا) تو معروف فعل ہے اور ''نہی'' کا لفظ اردو میں بھی عام استعمال ہوتا ہے۔ لہٰذا ﴿يَنْهَوْنَ عَنْهُ﴾ کے معنی ہیں ''وہ روکتے ہیں اس سے''۔ کس کو روکتے ہیں؟ اپنے عوام کو۔ ان کی لیڈری اور سرداری عوام کے بل پر ہی تو ہے۔ عوام برگشتہ ہو جائیں گے تو اُن کی لیڈری کہاں رہے گی۔ عوام کو اپنے قابو میں کرنا اور ان کی عقل اور سمجھ پر اپنا تسلّط قائم رکھنا ایسے نام نہاد لیڈروں کے لیے انتہائی ضروری ہوتا ہے۔ لہٰذا ایک طرف تو وہ اپنے عوام کو راہِ ہدایت اختیار کرنے سے روکتے ہیں اور دوسری طرف وہ خود اس سے گریز اور پہلوتہی کرتے ہیں۔ نَاٰی یَنْاٰی نَأْیًا کا مفہوم ہے دور ہونا' کنی کترانا جیسے سورۂ بنی اسرائیل (آیت ۸۳) میں فرمایا: ﴿وَاِذَآ اَنْعَمْنَا عَلَى الْاِنْسَانِ اَعْرَضَ وَنَاٰ بِجَانِبِهٖ ۚ﴾ ''اور انسان کا حال یہ ہے کہ جب ہم اس پر انعام کرتے ہیں تو منہ پھیر لیتا اور پہلوتہی کرتا ہے''۔ چنانچہ ﴿يَنْـَٔوْنَ عَنْهُ ۖ﴾ کے معنی ہیں ''وہ اس سے گریز کرتے ہیں' کنی کتراتے ہیں۔''

﴿وَاِنْ يُّهْلِكُوْنَ اِلَّآ اَنْفُسَهُمْ وَمَا يَشْعُرُوْنَ ﴿۲۶﴾﴾ ''اور وہ نہیں ہلاک کر رہے کسی کو سوائے اپنے آپ کے لیکن انہیں اس کا احساس نہیں ہے۔''

**آیت ۲۷** ﴿وَلَوْ تَرٰٓى اِذْ وُقِفُوْا عَلَى النَّارِ فَقَالُوْا يٰلَيْتَنَا نُرَدُّ وَلَا نُكَذِّبَ بِاٰيٰتِ رَبِّنَا﴾ ''اور کاش تم دیکھ پاتے جب یہ کھڑے کیے جائیں گے آگ کے کنارے پر تو یہ کہیں گے ہائے کاش! کسی طرح ہمیں لوٹا دیا جائے (تو ہم تصدیق کریں گے) اور ہم اپنے رب کی آیات کو نہیں جھٹلائیں گے''

یہاں پر نُرَدُّ کے بعد فَنُصَدِّقُ محذوف مانا جائے گا' کہ اگر ہمیں لوٹا دیا جائے تو ہم تصدیق کریں گے اور اپنے ربّ کی آیات کو جھٹلائیں گے نہیں۔ کاش کسی نہ کسی طرح ایک دفعہ پھر ہمیں دنیا میں واپس بھیج دیا جائے۔

﴿وَنَكُوْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۲۷﴾﴾ ''اور ہم (پکّے اور سچّے) مؤمن بن جائیں گے۔''

**آیت ۲۸** ﴿بَلْ بَدَا لَهُمْ مَّا كَانُوْا يُخْفُوْنَ مِنْ قَبْلُ ؕ﴾ ''بلکہ یہ تو ان پر وہی حقیقت ظاہر ہوئی ہے جو اس سے پہلے (اپنے دل میں) چھپائے ہوئے تھے۔''

ایسا نہیں تھا کہ انہیں حقیقت کا علم نہیں تھا۔ حق پہلے ہی ان پر واضح تھا' بات ان پر پوری طرح کھل چکی تھی' لیکن اس وقت ان پر حسد' بغض اور تکبّر کے پردے پڑے ہوئے تھے۔

﴿وَلَوْ رُدُّوْا لَعَادُوْا لِمَا نُهُوْا عَنْهُ وَاِنَّهُمْ لَكٰذِبُوْنَ۝۲۸﴾ ''اور اگر (بالفرض) انہیں لوٹا بھی دیا جائے تو پھر وہی کریں گے جس سے انہیں روکا جا رہا تھا اور یقیناً وہ جھوٹے ہیں۔''

دنیا میں جا کر پھر وہاں کے تقاضے سامنے آ جائیں گے' دنیا کے مال و دولت اور اولاد کی محبت اور دوسری نفسیاتی خواہشات پھر انہیں اسی راستے پر ڈال دیں گی۔

**آیت ۲۹** ﴿وَ قَالُوْٓا اِنْ هِيَ اِلَّا حَيَاتُنَا الدُّنْيَا وَمَا نَحْنُ بِمَبْعُوْثِيْنَ۝۲۹﴾ ''اور وہ کہتے ہیں کہ نہیں ہے مگر بس ہماری دنیا ہی کی زندگی اور ہم (مرنے کے بعد) پھر زندہ نہیں کیے جائیں گے۔''

جیسے آج کل کفر و الحاد کے مختلف shades ہیں' اُس زمانے میں بھی ایسا ہی تھا۔ آج ایسے لوگ بھی دنیا میں موجود ہیں جو اللہ کو تو مانتے ہیں' آخرت کو نہیں مانتے۔ ایسے لوگ بھی ہیں جو اللہ اور آخرت کو مانتے ہیں لیکن رسالت کو نہیں مانتے ہیں۔ کچھ ایسے لوگ بھی ہیں جو بالکل ملحد اور مادہ پرست ہیں اور ان کا عقیدہ ہے کہ ہم خود ہی پیدا ہوتے ہیں اور خود ہی اپنی طبعی موت مر جاتے ہیں' اور ہماری زندگی صرف یہی ہے' مرنے کے بعد اٹھنے والا کوئی معاملہ نہیں۔ اسی طرح اُس دور میں بھی کفر و شرک کے مختلف shades موجود تھے۔ قریش کے اکثر لوگ اور عرب کے بیشتر مشرکین اللہ کو مانتے تھے' آخرت کو مانتے تھے' بعث بعد الموت کو بھی مانتے تھے' لیکن اس کے ساتھ وہ دیوی دیوتاؤں کی سفارش اور شفاعت کے قائل تھے کہ ہمیں فلاں چھڑا لے گا' فلاں بچا لے گا' فلاں ہمارا حمایتی اور مددگار ہو گا۔ لیکن ایک طبقہ ان میں بھی ایسا تھا جو کہتا تھا کہ زندگی بس یہی دنیا کی ہے' اس کے بعد کوئی اور زندگی نہیں ہے۔ یہاں اس آیت میں ان لوگوں کا تذکرہ ہے۔

**آیت ۳۰** ﴿وَلَوْ تَرٰٓى اِذْ وُقِفُوْا عَلٰى رَبِّهِمْ ۭ قَالَ اَلَيْسَ هٰذَا بِالْحَقِّ ۭ﴾ ''اور کاش کہ تم دیکھ سکتے جبکہ یہ کھڑے کیے جائیں گے اپنے ربّ کے سامنے۔ (اُس وقت) وہ پوچھے گا کیا یہ حق نہیں ہے؟''

﴿قَالُوْا بَلٰى وَرَبِّنَا ۭ قَالَ فَذُوْقُوا الْعَذَابَ بِمَا كُنْتُمْ تَكْفُرُوْنَ۝۳۰﴾ ''وہ کہیں گے کیوں نہیں' ہمارے ربّ کی قسم (کہ یہ حق ہے)! تو وہ کہے گا کہ اب مزا چکھو عذاب کا اپنے کفر کی پاداش میں۔''



## آیات ۳۱ تا ۴۱

قَدْ خَسِرَ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِلِقَاۗءِ اللّٰهِ ۭ حَتّٰٓى اِذَا جَاۗءَتْهُمُ السَّاعَةُ بَغْتَةً قَالُوْا يٰحَسْرَتَنَا عَلٰي مَا فَرَّطْنَا فِيْهَا ۙ وَهُمْ يَحْمِلُوْنَ اَوْزَارَهُمْ عَلٰي ظُهُوْرِهِمْ ۭ اَلَا سَاۗءَ مَا يَزِرُوْنَ۝۳۱ وَمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَآ اِلَّا لَعِبٌ وَّلَهْوٌ ۭ وَلَلدَّارُ الْاٰخِرَةُ خَيْرٌ لِّلَّذِيْنَ يَتَّقُوْنَ ۭ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ۝۳۲ قَدْ نَعْلَمُ اِنَّهٗ لَيَحْزُنُكَ الَّذِيْ يَقُوْلُوْنَ فَاِنَّهُمْ لَا يُكَذِّبُوْنَكَ وَلٰكِنَّ الظّٰلِمِيْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ يَجْحَدُوْنَ۝۳۳ وَلَقَدْ كُذِّبَتْ رُسُلٌ مِّنْ قَبْلِكَ فَصَبَرُوْا عَلٰي مَا كُذِّبُوْا وَاُوْذُوْا حَتّٰٓى اَتٰىهُمْ نَصْرُنَا ۚ وَلَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِ اللّٰهِ ۚ وَلَقَدْ جَاۗءَكَ مِنْ نَّبَاِ الْمُرْسَلِيْنَ۝۳۴ وَاِنْ كَانَ كَبُرَ عَلَيْكَ اِعْرَاضُهُمْ فَاِنِ اسْتَطَعْتَ اَنْ تَبْتَغِيَ نَفَقًا فِي الْاَرْضِ اَوْ سُلَّمًا فِي السَّمَاۗءِ فَتَاْتِيَهُمْ بِاٰيَةٍ ۭ وَلَوْ شَاۗءَ اللّٰهُ لَجَمَعَهُمْ عَلَي الْهُدٰى فَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْجٰهِلِيْنَ۝۳۵ اِنَّمَا يَسْتَجِيْبُ الَّذِيْنَ يَسْمَعُوْنَ ۘ وَالْمَوْتٰى يَبْعَثُهُمُ اللّٰهُ ثُمَّ اِلَيْهِ يُرْجَعُوْنَ۝۳۶ وَقَالُوْا لَوْلَا نُزِّلَ عَلَيْهِ اٰيَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ ۭ قُلْ اِنَّ اللّٰهَ قَادِرٌ عَلٰٓى اَنْ يُّنَزِّلَ اٰيَةً وَّلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ۝۳۷ وَمَا مِنْ دَاۗبَّةٍ فِي الْاَرْضِ وَلَا طٰۗىِٕرٍ يَّطِيْرُ بِجَنَاحَيْهِ اِلَّآ اُمَمٌ اَمْثَالُكُمْ ۭ مَا فَرَّطْنَا فِي الْكِتٰبِ مِنْ شَيْءٍ ثُمَّ اِلٰى رَبِّهِمْ يُحْشَرُوْنَ۝۳۸ وَالَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا صُمٌّ وَّبُكْمٌ فِي الظُّلُمٰتِ ۭ مَنْ يَّشَاِ اللّٰهُ يُضْلِلْهُ ۭ وَمَنْ يَّشَاْ يَجْعَلْهُ عَلٰي صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ۝۳۹ قُلْ اَرَءَيْتَكُمْ اِنْ اَتٰىكُمْ عَذَابُ اللّٰهِ اَوْ اَتَتْكُمُ السَّاعَةُ اَغَيْرَ اللّٰهِ تَدْعُوْنَ ۚ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ۝۴۰ بَلْ اِيَّاهُ تَدْعُوْنَ فَيَكْشِفُ مَا تَدْعُوْنَ اِلَيْهِ اِنْ شَاۗءَ وَتَنْسَوْنَ مَا تُشْرِكُوْنَ۝۴۱

**آیت ۳۱** ﴿قَدْ خَسِرَ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِلِقَآءِ اللّٰهِ﴾ ’’بڑے گھاٹے میں پڑ گئے وہ لوگ جو اللہ سے ملاقات کے انکاری ہیں۔‘‘

وہ اس بات کو جھٹلا رہے ہیں کہ مرنے کے بعد کوئی پیشی‘ حاضری یا اللہ سے ملاقات وغیرہ ہوگی۔

﴿حَتّٰٓى اِذَا جَآءَتْهُمُ السَّاعَةُ بَغْتَةً﴾ ’’یہاں تک کہ جب آ جائے گا ان پر وہ وقت اچانک‘‘

ایک شخص کے لیے انفرادی طور پر تو السَّاعَة (گھڑی) سے مراد اُس کی موت کا وقت ہے‘ لیکن عام طور پر اس سے قیامت ہی مراد لی گئی ہے۔ چنانچہ اس کا مطلب ہے کہ جب قیامت اچانک آ جائے گی۔

﴿قَالُوْا يٰحَسْرَتَنَا عَلٰى مَا فَرَّطْنَا فِيْهَا ۙ وَهُمْ يَحْمِلُوْنَ اَوْزَارَهُمْ عَلٰى ظُهُوْرِهِمْ ۭ اَلَا سَاۗءَ مَا يَزِرُوْنَ﴾ ’’تو وہ کہیں گے ہائے افسوس ہماری اس کوتاہی پر جو اس (قیامت) کے بارے میں ہم سے ہوئی‘ اور وہ اٹھائے ہوئے ہوں گے اپنے بوجھ اپنی پیٹھوں پر۔ آگاہ ہو جاؤ‘ بہت بُرا بوجھ ہوگا جو وہ اٹھائے ہوئے ہوں گے۔‘‘

جب قیامت حق بن کر سامنے آ جائے گی تو ان کی حسرت کی کوئی انتہا نہ رہے گی۔ وہ اپنی پیٹھوں پر کفر‘ شرک اور گناہوں کے بوجھ اٹھائے ہوئے میدانِ حشر میں پیش ہوں گے۔

**آیت ۳۲** ﴿وَمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَآ اِلَّا لَعِبٌ وَّلَهْوٌ ۭ﴾ ’’اور نہیں ہے دُنیا کی زندگی مگر کھیل اور کچھ جی بہلا لینا۔‘‘

اس کا مطلب یہ نہیں لینا چاہیے کہ دنیا کی زندگی کی کوئی حقیقت نہیں ہے‘ بلکہ تقابل میں ایسا کہا جاتا ہے کہ آخرت کے مقابلے میں اس کی یہی حقیقت ہے۔ ایک شے ابدی ہے‘ ہمیشہ ہمیش کی ہے اور ایک شے عارضی اور فانی ہے۔ ان دونوں کا آپس میں کیا مقابلہ؟ جیسے دعائے استخارہ میں الفاظ آئے ہیں: فَاِنَّكَ تَعْلَمُ وَلَا اَعْلَمُ (اے اللہ! تو ہی سب کچھ جانتا ہے‘ میں کچھ نہیں جانتا)۔ اس کا یہ مطلب تو نہیں ہے کہ انسان کے پاس کوئی بھی علم نہیں ہے‘ لیکن اللہ کے علم کے مقابلے میں کسی دوسرے کا علم کچھ نہ ہونے کے برابر ہے۔ اسی طرح یہاں آخرت کے مقابلے میں دُنیا کی زندگی کو لعب اور لہو قرار دیا گیا ہے۔ ورنہ دنیا تو ایک اعتبار سے آخرت



کی کھیتی ہے۔ ایک حدیث بھی بیان کی جاتی ہے کہ ((اَلدُّنْيَا مَزْرَعَةُ الْآخِرَةِ))(۱) ’’دنیا آخرت کی کھیتی ہے‘‘۔ یہاں بوؤ گے تو وہاں کاٹو گے۔ اگر یہاں بوؤ گے نہیں تو وہاں کاٹو گے کیا؟ یہ تعلق ہے آپس میں دنیا اور آخرت کا۔ اس اعتبار سے دنیا ایک حقیقت ہے اور ایک امتحانی وقفہ ہے۔ لیکن جب آپ تقابل کریں گے دنیا اور آخرت کا تو دنیا اور اس کا مال و متاع آخرت کی ابدیت اور اس کی شان و شوکت کے مقابلے میں گویا نہ ہونے کے برابر ہے۔ دنیا تو محض تین گھنٹے کے ایک ڈرامہ کی مانند ہے جس میں کسی کو بادشاہ بنا دیا جاتا ہے اور کسی کو فقیر۔ جب ڈرامہ ختم ہوتا ہے تو نہ بادشاہ سلامت بادشاہ ہیں اور نہ فقیر فقیر ہے۔ ڈرامہ ہال سے باہر جا کر کپڑے تبدیل کیے اور سب ایک جیسے بن گئے۔ یہ ہے دنیا کی اصل حقیقت۔ چنانچہ اس آیت میں دنیا کو کھیل تماشا قرار دیا گیا ہے۔

﴿وَلَلدَّارُ الْاٰخِرَةُ خَيْرٌ لِّلَّذِيْنَ يَتَّقُوْنَ ۭ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ﴾ ’’اور یقیناً آخرت کا گھر بہتر ہے ان لوگوں کے لیے جو تقویٰ اختیار کریں‘ تو کیا تم عقل سے کام نہیں لیتے؟‘‘

اب وہ مقام آ گیا ہے جسے میں نے اس سورۃ کے عمود کا ذروۂ سنام (climax) قرار دیا تھا۔ یہاں ترجمہ کرتے ہوئے زبان لڑکھڑاتی ہے‘ لیکن ہمیں ترجمانی کی کوشش تو بہرحال کرنی ہے۔

**آیت ۳۳** ﴿قَدْ نَعْلَمُ اِنَّهٗ لَيَحْزُنُكَ الَّذِيْ يَقُوْلُوْنَ﴾ ’’(اے نبی ﷺ) ہمیں خوب معلوم ہے جو کچھ یہ کہہ رہے ہیں اس سے آپ غمگین ہوتے ہیں‘‘

ہم جانتے ہیں کہ جو مطالبات یہ لوگ کر رہے ہیں‘ آپ سے جو معجزات کا تقاضا کر رہے ہیں اس سے آپ رنجیدہ ہوتے ہیں۔ آپ کی ذات گویا چکّی کے دو پاٹوں کے درمیان آ گئی ہے۔ ایک طرف اللہ کی مشیّت ہے اور دوسری طرف ان لوگوں کے تقاضے۔ اب اس کا پہلا جواب تو یہ ہے:

---

(۱) اسے حافظ زین الدین العراقی نے ’’تخریج الاحیاء‘‘ (۴/۲۴) میں‘ علامہ محمد بن عبدالرحمٰن السخاوی نے ’’المقاصد الحسنہ‘‘ (ح ۲۶۰) میں‘ ملا علی قاری نے ’’الاسرار المرفوعة فی الاخبار الموضوعة‘‘ (ح ۲۰۶) میں اور علامہ زرقانی نے ’’مختصر المقاصد‘‘ (ح ۴۶۷) میں نقل کیا ہے۔ اس حدیث کے بارے میں محدثین کی آراء کا خلاصہ یہ ہے: قیل لا اصل له او باصله موضوع۔ (مرتب)

﴿فَاِنَّهُمْ لَا يُكَذِّبُوْنَكَ وَلٰكِنَّ الظّٰلِمِيْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ يَجْحَدُوْنَ ﴿۳۳﴾﴾

''تو (اے نبی ﷺ آپ صبر کیجیے) یقیناً وہ آپ کو نہیں جھٹلا رہے' بلکہ یہ ظالم تو اللہ کی نشانیوں کا انکار کر رہے ہیں۔''

یہ لوگ قرآن کا انکار کر رہے ہیں' ہمارا انکار کر رہے ہیں' آپؐ کا انکار انہوں نے کب کیا ہے؟ یہاں سمجھانے کے اس انداز پر غور کیجیے! کیا انہوں نے آپؐ کو جھوٹا کہا؟ نہیں کہا! آپؐ پر کوئی تہمت انہوں نے لگائی؟ نہیں لگائی! لہٰذا یہ لوگ جو تکذیب کر رہے ہیں' یہ آپؐ کی تکذیب تو نہیں ہو رہی' تکذیب تو ہماری ہو رہی ہے' غصہ تو ہمیں آنا چاہیے' ناراض تو ہمیں ہونا چاہیے۔ یہ ہمارا کلام ہے اور یہ لوگ ہمارے کلام کو جھٹلا رہے ہیں۔ آپؐ کا کام تو ہمارے کلام کو ان تک پہنچا دینا ہے۔ یہ سمجھانے کا ایک بڑا پیارا انداز ہے' جیسے کوئی شفیق استاد اپنے شاگرد کو سمجھا رہا ہو۔ لیکن اب یہ بات درجہ بدرجہ آگے بڑھے گی۔ لہٰذا ان آیات کو پڑھتے ہوئے یہ اصول ذہن میں ضرور رکھئے کہ اَلرَّبُّ رَبٌّ وَاِنْ تَنَزَّلَ وَالْعَبْدُ عَبْدٌ وَاِنْ تَرَقّٰی۔ اب اس ضمن میں دوسرا جواب ملاحظہ ہو:

**آیت ۳۴** ﴿وَلَقَدْ كُذِّبَتْ رُسُلٌ مِّنْ قَبْلِكَ فَصَبَرُوْا عَلٰى مَا كُذِّبُوْا وَاُوْذُوْا حَتّٰٓى اَتٰىهُمْ نَصْرُنَا ۚ وَلَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِ اللّٰهِ ۚ﴾ ''اور آپؐ سے پہلے بھی رسولوں کو جھٹلایا گیا تو انہوں نے صبر کیا اس پر جو انہیں جھٹلایا گیا اور جو انہیں ایذائیں پہنچائی گئیں' یہاں تک کہ انہیں ہماری مدد پہنچ گئی۔ اور (اے نبی ﷺ) اللہ کے ان کلمات کو بدلنے والا کوئی نہیں۔''

ہمارا ایک قانون' ایک طریقہ اور ایک ضابطہ ہے' اس لیے آپ (ﷺ) کو یہ سب کچھ برداشت کرنا پڑے گا۔ آپ کو جس منصب پر فائز کیا گیا ہے اس کے بارے میں ہم نے پہلے ہی بتا دیا تھا کہ یہ بہت بھاری بوجھ ہے۔ ﴿اِنَّا سَنُلْقِيْ عَلَيْكَ قَوْلًا ثَقِيْلًا ﴿۵﴾﴾ (المزمل) ''بے شک ہم آپ پر عنقریب ایک بھاری بوجھ ڈالنے والے ہیں۔''

﴿وَلَقَدْ جَآءَكَ مِنْ نَّبَاِ الْمُرْسَلِيْنَ ﴿۳۴﴾﴾ ''اور آپؐ کے پاس رسولوں کی خبریں آ چکی ہیں۔''

آپ (ﷺ) کے علم میں ہے کہ ہمارے بندے نوح (علیہ السلام) نے ساڑھے نو سو برس تک



صبر کیا۔ اب اس کے بعد تلخ ترین بات آ رہی ہے۔

**آیت ۳۵** ﴿وَاِنْ كَانَ كَبُرَ عَلَيْكَ اِعْرَاضُهُمْ فَاِنِ اسْتَطَعْتَ اَنْ تَبْتَغِيَ نَفَقًا فِي الْاَرْضِ اَوْ سُلَّمًا فِي السَّمَآءِ فَتَاْتِيَهُمْ بِاٰيَةٍ ۭ﴾ ''اور اگر ان کا اعراض آپؐ پر بہت شاق گزر رہا ہے تو اگر آپ میں طاقت ہے کہ زمین میں کوئی سرنگ لگا لیں یا آسمان میں کوئی سیڑھی لگا لیں تو لے آئیں کوئی نشانی۔''

ہمارا تو فیصلہ اٹل ہے کہ ہم کوئی ایسا معجزہ نہیں دکھائیں گے' آپ لے آئیں جہاں سے لا سکتے ہیں۔ غور کریں کس انداز میں حضور ﷺ سے گفتگو ہو رہی ہے۔

﴿وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَجَمَعَهُمْ عَلَى الْهُدٰى﴾ ''اور اگر اللہ چاہتا تو ان سب کو ہدایت پر جمع کر دیتا''

اگر اللہ چاہتا تو آن واحد میں سب کو صاحبِ ایمان بنا دیتا' نیک بنا دیتا۔

﴿فَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْجٰهِلِيْنَ ﴿۳۵﴾﴾ ''تو آپؐ جذبات سے مغلوب ہونے والوں میں سے نہ بنیں!''

اس معاملے میں آپ جذباتی نہ ہوں۔ یہی لفظ سورۂ ہود میں حضرت نوح علیہ السلام سے خطاب میں آیا ہے۔ جب حضرت نوحؑ نے عرض کی کہ اے اللہ میرا بیٹا میری نگاہوں کے سامنے غرق ہو گیا جب کہ تیرا وعدہ تھا کہ میرے اہل کو تو بچا لے گا: ﴿اِنَّ ابْنِيْ مِنْ اَهْلِيْ وَاِنَّ وَعْدَكَ الْحَقُّ﴾ (ھود: ۴۵) ''میرا بیٹا میرے گھر والوں میں سے ہے اور تیرا وعدہ سچا ہے''۔ تو اس کا جواب بھی بہت سخت تھا: ﴿اِنِّيْٓ اَعِظُكَ اَنْ تَكُوْنَ مِنَ الْجٰهِلِيْنَ ﴿۴۶﴾﴾ ''میں تمہیں نصیحت کرتا ہوں کہ تم جاہلوں میں سے نہ ہو جاؤ''۔ ذرا غور کریں' یہ اللہ کا وہ بندہ ہے جس نے ساڑھے نو سو برس تک اللہ کی چاکری کی' اللہ کے دین کی دعوت پھیلائی' اس میں محنت کی' مشقت کی اور ہر طرح کی مشکلات اٹھائیں۔ لیکن اللہ کی شان بہت بلند ہے' بہت بلند ہے' بہت بلند ہے! اسی لیے فرمایا کہ اے نبی (ﷺ) اگر سب کو ہدایت پر لانا مقصود ہو تو ہمارے لیے کیا مشکل ہے کہ ہم آنِ واحد میں سب کو ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی مانند بنا دیں' اور اگر ہم سب کو بگاڑنا چاہیں تو آنِ واحد میں سب کے سب ابلیس بن جائیں۔ مگر اصل مقصود تو امتحان ہے' آزمائش ہے۔ جو حق پر چلنا چاہتا ہے' حق کا طالب ہے اس کو حق مل جائے گا۔

**آیت ۳۶** ﴿اِنَّمَا یَسْتَجِیْبُ الَّذِیْنَ یَسْمَعُوْنَ ؕ وَالْمَوْتٰی یَبْعَثُهُمُ اللّٰهُ ثُمَّ اِلَیْهِ یُرْجَعُوْنَ۳۶﴾ ''بات تو وہی قبول کریں گے جو (حقیقتاً) سنتے ہیں' رہے یہ مُردے تو اللہ ان کو اٹھائے گا' پھر وہ اُسی کی طرف لوٹا دیے جائیں گے۔''

**آیت ۳۷** ﴿وَقَالُوْا لَوْلَا نُزِّلَ عَلَیْهِ اٰیَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ ؕ﴾ ''اور وہ کہتے ہیں کیوں نہیں اُتار دی گئی اُن پر کوئی نشانی اُن کے ربّ کی طرف سے؟''

ان کے پاس دلیل بس یہی ایک رہ گئی تھی کہ اگر یہ اللہ کے رسول ہیں تو ان پر ان کے پروردگار کی طرف سے کوئی نشانی کیوں نہیں اتار دی جاتی؟ اسی ایک حجّت پر انہوں نے ڈیرہ لگا لیا تھا۔ باقی ساری دلیلوں میں وہ مات کھا رہے تھے۔ دراصل انہیں بھی اندازہ ہو چکا تھا کہ ان حالات میں کوئی حسّی معجزہ دکھانا اللہ تعالیٰ کی مشیّت میں نہیں ہے۔ اس صورت حال میں حضور ﷺ کی طبیعت کی تنگی (ضیق) کا اندازہ اس سے لگائیں کہ قرآن میں بار بار اس کا ذکر آتا ہے۔ سورۃ الحجر میں اسی کیفیت کا ذکر ان الفاظ میں آیا ہے: ﴿وَلَقَدْ نَعْلَمُ اَنَّكَ یَضِیْقُ صَدْرُكَ بِمَا یَقُوْلُوْنَ۹۷﴾ ''ہم خوب جانتے ہیں کہ آپ کا سینہ بھنچتا ہے ان باتوں سے جو یہ کہہ رہے ہیں.....''

﴿قُلْ اِنَّ اللّٰهَ قَادِرٌ عَلٰۤی اَنْ یُّنَزِّلَ اٰیَةً وَّلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا یَعْلَمُوْنَ۳۷﴾ ''کہہ دو' اللہ قادر ہے کہ وہ کوئی (بڑی سے بڑی) نشانی اُتار دے لیکن ان میں سے اکثر لوگ جانتے نہیں ہیں۔''

یہ لوگ نہیں جانتے کہ اس طرح کا معجزہ دکھانے کا نتیجہ کیا نکلے گا۔ اس طرح ان کی مہلت ختم ہو جائے گی۔ یہ ہماری رحمت ہے کہ ابھی ہم یہ معجزہ نہیں دکھا رہے۔ یہ بد بخت لوگ جس موقف پر مورچہ لگا کر بیٹھ گئے ہیں اس کی حسّاسیت کا انہیں علم ہی نہیں۔ انہیں معلوم نہیں ہے کہ معجزہ نہ دکھانا ان کے لیے ہماری رحمت کا ظہور ہے اور ہم ابھی انہیں مزید مہلت دینا چاہتے ہیں۔ ہم چاہتے ہیں کہ یہ دودھ ابھی اور بلویا جائے' شاید اس میں سے کچھ اور مکھن نکل آئے۔

**آیت ۳۸** ﴿وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِی الْاَرْضِ وَلَا طٰٓىِٕرٍ یَّطِیْرُ بِجَنَاحَیْهِ اِلَّاۤ اُمَمٌ اَمْثَالُكُمْ ؕ﴾ ''اور نہیں ہے زمین پر چلنے والا کوئی بھی جانور اور نہ کوئی پرندہ جو اپنے دونوں بازوؤں سے اڑتا ہے' مگر وہ بھی تمہاری ہی طرح کی اُمّتیں ہیں۔''



ان تمام جانوروں' پرندوں اور کیڑوں مکوڑوں کے رہنے سہنے کے بھی اپنے اپنے طور طریقے اور نظام ہیں' ان کے اپنے leaders ہوتے ہیں۔ یہ چیزیں آج کی سائنسی تحقیق سے ثابت شدہ ہیں۔ چیونٹیوں کی ایک ملکہ ہوتی ہے' جس کے ماتحت وہ رہتی اور کام وغیرہ کرتی ہیں۔ اسی طرح شہد کی مکھیوں کی بھی ملکہ ہوتی ہے۔

﴿مَا فَرَّطْنَا فِی الْكِتٰبِ مِنْ شَیْءٍ ثُمَّ اِلٰی رَبِّهِمْ یُحْشَرُوْنَ۳۸﴾ ''ہم نے تو اپنی کتاب میں کسی شے کی کوئی کمی نہیں رکھی ہے' پھر یہ اپنے ربّ کی طرف لوٹائے جائیں گے۔''

قرآن میں ہم نے ہر طرح کے دلائل دے دیے ہیں' ہر طرح کے شواہد پیش کر دیے ہیں' ہر طرح سے استشہاد کر دیا ہے۔ ان سب کو آخر کار اپنے ربّ کے حضور پیش ہونا ہے۔ وہاں پر ہر ایک کو اپنے کیے کا پورا بدلہ مل جائے گا۔

**آیت ۳۹** ﴿وَالَّذِیْنَ كَذَّبُوْا بِاٰیٰتِنَا صُمٌّ وَّبُكْمٌ فِی الظُّلُمٰتِ ؕ﴾ ''اور جن لوگوں نے ہماری آیات کو جھٹلایا وہ بہرے اور گونگے ہیں (اور) اندھیروں میں (بھٹک رہے) ہیں۔''

﴿مَنْ یَّشَاِ اللّٰهُ یُضْلِلْهُ ؕ وَمَنْ یَّشَاْ یَجْعَلْهُ عَلٰی صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ۳۹﴾ ''جس کو اللہ چاہتا ہے گمراہ کر دیتا ہے اور جس کو چاہتا ہے سیدھے راستے پر لے آتا ہے۔''

''اللہ گمراہ کر دیتا ہے'' کا مفہوم یہ ہے کہ اس کی گمراہی پر مہرِ تصدیق ثبت کر دیتا ہے' اس کی گمراہی کا فیصلہ کر دیتا ہے۔

**آیت ۴۰** ﴿قُلْ اَرَءَیْتَكُمْ اِنْ اَتٰىكُمْ عَذَابُ اللّٰهِ اَوْ اَتَتْكُمُ السَّاعَةُ اَغَیْرَ اللّٰهِ تَدْعُوْنَ ۚ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ۴۰﴾ ''ان سے کہیے' ذرا غور کرو' اگر تم پر (کسی وقت) اللہ کا عذاب آ جائے یا تم پر قیامت آ جائے تو (اُس وقت) کیا تم سوائے اللہ کے کسی اور کو پکارو گے؟ اگر تم سچّے ہو (تو ذرا جواب دو)!''

یہ بھی متجسّسانہ (searching) انداز میں ان سے سوال کیا جا رہا ہے۔ یہ ان کا معمول بھی تھا اور مشاہدہ بھی' کہ جب بھی کبھی کوئی مصیبت آتی' سمندر میں سفر کے دوران کبھی طوفان آ جاتا' موت سامنے نظر آنے لگتی تو پھر لات' منات' عُزّیٰ' ہُبل وغیرہ میں سے کوئی بھی

دوسرا خدا انہیں یاد نہ رہتا۔ ایسے مشکل وقت میں وہ صرف اللہ ہی کو پکارتے تھے۔ چنانچہ خود ان سے سوال کیا جا رہا ہے کہ ہر شخص ذرا اپنے دل سے پوچھے' کہ آخر مصیبت کے وقت ہمیں ایک اللہ ہی کیوں یاد آتا ہے؟ گویا ایک اللہ کو ماننا اور اس پر ایمان رکھنا انسان کی فطرت کا تقاضا ہے۔ کسی شخص میں شرافت کی کچھ بھی رمق موجود ہو تو اس طرح کے سوالات کے جواب میں اس کا دل ضرور گواہی دیتا ہے کہ ہاں بات تو ٹھیک ہے' ایسے مواقع پر ہماری اندرونی کیفیت بالکل ایسی ہی ہوتی ہے اور بے اختیار ''اللہ'' ہی کا نام زبان پر آتا ہے۔

**آیت ۴۱** ﴿بَلْ اِيَّاهُ تَدْعُوْنَ فَيَكْشِفُ مَا تَدْعُوْنَ اِلَيْهِ اِنْ شَآءَ وَتَنْسَوْنَ مَا تُشْرِكُوْنَ ۝۴۱﴾ ''بلکہ (مصیبت کی گھڑی میں) تم اُسی کو پکارتے ہو' پھر اگر وہ چاہتا ہے تو جس تکلیف کے لیے تم اسے پکارتے ہو وہ دُور کر دیتا ہے اور (ایسے مواقع پر) تم بھول جاتے ہو اُن کو جن کو تم شریک ٹھہراتے ہو۔''

## آیات ۴۲ تا ۵۰

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَآ اِلٰٓى اُمَمٍ مِّنْ قَبْلِكَ فَاَخَذْنٰهُمْ بِالْبَاْسَآءِ وَالضَّرَّآءِ لَعَلَّهُمْ يَتَضَرَّعُوْنَ ۝۴۲ فَلَوْلَآ اِذْ جَآءَهُمْ بَاْسُنَا تَضَرَّعُوْا وَلٰكِنْ قَسَتْ قُلُوْبُهُمْ وَزَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطٰنُ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ۝۴۳ فَلَمَّا نَسُوْا مَا ذُكِّرُوْا بِهٖ فَتَحْنَا عَلَيْهِمْ اَبْوَابَ كُلِّ شَيْءٍ ؕ حَتّٰٓى اِذَا فَرِحُوْا بِمَآ اُوْتُوْٓا اَخَذْنٰهُمْ بَغْتَةً فَاِذَا هُمْ مُّبْلِسُوْنَ ۝۴۴ فَقُطِعَ دَابِرُ الْقَوْمِ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا ؕ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝۴۵ قُلْ اَرَءَيْتُمْ اِنْ اَخَذَ اللّٰهُ سَمْعَكُمْ وَاَبْصَارَكُمْ وَخَتَمَ عَلٰى قُلُوْبِكُمْ مَّنْ اِلٰهٌ غَيْرُ اللّٰهِ يَاْتِيْكُمْ بِهٖ ؕ اُنْظُرْ كَيْفَ نُصَرِّفُ الْاٰيٰتِ ثُمَّ هُمْ يَصْدِفُوْنَ ۝۴۶ قُلْ اَرَءَيْتَكُمْ اِنْ اَتٰىكُمْ عَذَابُ اللّٰهِ بَغْتَةً اَوْ جَهْرَةً هَلْ يُهْلَكُ اِلَّا الْقَوْمُ الظّٰلِمُوْنَ ۝۴۷ وَمَا نُرْسِلُ الْمُرْسَلِيْنَ اِلَّا مُبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ ۚ فَمَنْ اٰمَنَ وَاَصْلَحَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ۝۴۸ وَالَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا



يَمَسُّهُمُ الْعَذَابُ بِمَا كَانُوْا يَفْسُقُوْنَ ۝۴۹ قُلْ لَّآ اَقُوْلُ لَكُمْ عِنْدِيْ خَزَآئِنُ اللّٰهِ وَلَآ اَعْلَمُ الْغَيْبَ وَلَآ اَقُوْلُ لَكُمْ اِنِّيْ مَلَكٌ ۚ اِنْ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا يُوْحٰٓى اِلَيَّ ؕ قُلْ هَلْ يَسْتَوِي الْاَعْمٰى وَالْبَصِيْرُ ؕ اَفَلَا تَتَفَكَّرُوْنَ ۝۵۰ ع

**آیت ۴۲** ﴿وَلَقَدْ اَرْسَلْنَآ اِلٰٓى اُمَمٍ مِّنْ قَبْلِكَ فَاَخَذْنٰهُمْ بِالْبَاْسَآءِ وَالضَّرَّآءِ لَعَلَّهُمْ يَتَضَرَّعُوْنَ ۝۴۲﴾ ''اور ہم نے بھیجا ہے بہت سی اُمتوں کی طرف آپؐ سے قبل (رسولوں کو)' پھر ہم نے پکڑا انہیں سختیوں اور تکلیفوں سے' شاید کہ وہ عاجزی کریں۔''

یہاں رسولوں کے بارے میں ایک اہم قانون بیان ہو رہا ہے (واضح رہے کہ یہاں انبیاء نہیں بلکہ رسول مراد ہیں۔) جب بھی کسی قوم کی طرف کوئی رسول بھیجا جاتا تھا تو اس قوم کو خوابِ غفلت سے جگانے کے لیے اللہ تعالیٰ کی طرف سے چھوٹے چھوٹے عذاب آتے تھے' لیکن اگر وہ قوم اس کے باوجود بھی نہ سنبھلتی اور اپنے رسول پر ایمان نہ لاتی' تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کی رسّی ڈھیلی کر دی جاتی تھی' تاکہ جو چند دن کی مہلت ہے اس میں وہ خوب دل کھول کر من مانیاں کر لیں۔ پھر اچانک اللہ کا بڑا عذاب ان کو آ پکڑتا تھا جس سے وہ قوم نیست و نابود کر دی جاتی تھی۔ یہ مضمون اصل میں سورۃ الاعراف کا عمود ہے اور وہاں بڑی تفصیل سے بیان ہوا ہے۔

**آیت ۴۳** ﴿فَلَوْلَآ اِذْ جَآءَهُمْ بَاْسُنَا تَضَرَّعُوْا وَلٰكِنْ قَسَتْ قُلُوْبُهُمْ وَزَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطٰنُ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ۝۴۳﴾ ''تو کیوں نہ ایسا ہوا کہ جب ہماری طرف سے کوئی سختی ان پر آئی تو وہ گڑگڑاتے' لیکن ان کے دل تو سخت ہو چکے تھے اور شیطان نے مزیّن کیے رکھا ان کے لیے ان اعمال کو جو وہ کر رہے تھے۔''

یعنی اللہ کی طرف سے بار بار کی تنبیہات کے باوجود سوچنے' سمجھنے اور اپنے رویّے پر نظرِ ثانی کرنے کے لیے آمادہ نہیں ہوئے۔

**آیت ۴۴** ﴿فَلَمَّا نَسُوْا مَا ذُكِّرُوْا بِهٖ فَتَحْنَا عَلَيْهِمْ اَبْوَابَ كُلِّ شَيْءٍ ؕ﴾ ''پھر جب انہوں نے بھلا دیا اس نصیحت کو جو ان کو کی گئی تھی تو ہم نے ان پر دروازے کھول دیے ہر چیز کے۔''

کہ اب کھاؤ پیو' عیش کرو' اب دنیا میں ہر قسم کی نعمتیں تمہیں ملیں گی' تاکہ اس دنیا میں جو

تمہارا نصیب ہے اس سے خوب فائدہ اٹھالو۔

﴿حَتّٰٓى اِذَا فَرِحُوْا بِمَآ اُوْتُوْٓا اَخَذْنٰهُمْ بَغْتَةً فَاِذَا هُمْ مُّبْلِسُوْنَ﴾ ''یہاں تک کہ جب وہ اِترانے لگے ان چیزوں پر جو انہیں مل گئی تھیں تو اچانک ہم نے انہیں پکڑ لیا' پھر وہ بالکل مایوس ہو کر رہ گئے۔''

**آیت ۴۵** ﴿فَقُطِعَ دَابِرُ الْقَوْمِ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا ؕ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ﴾ ''پھر جڑ کاٹ دی گئی اُس قوم کی جس نے ظلم (اور کفر و شرک) کی روش اختیار کی تھی' اور کُل شکر اور تعریف اللہ ہی کے لیے ہے جو تمام جہانوں کا پروردگار ہے۔''

**آیت ۴۶** ﴿قُلْ اَرَءَيْتُمْ اِنْ اَخَذَ اللّٰهُ سَمْعَكُمْ وَاَبْصَارَكُمْ وَخَتَمَ عَلٰى قُلُوْبِكُمْ مَّنْ اِلٰهٌ غَيْرُ اللّٰهِ يَاْتِيْكُمْ بِهٖ ؕ﴾ ''(اے نبی ﷺ ان سے) پوچھئے! کیا تم نے کبھی غور کیا کہ اگر اللہ تمہاری آنکھیں اور تمہارے کان چھین لے اور تمہارے دلوں پر مہر کر دے تو اللہ کے سوا کون سا معبود ہے جو دوبارہ تمہیں یہ (ساری صلاحیتیں) دلائے گا؟''

﴿اُنْظُرْ كَيْفَ نُصَرِّفُ الْاٰيٰتِ ثُمَّ هُمْ يَصْدِفُوْنَ﴾ ''دیکھئے ہم کس طرح ان کے لیے اپنی آیات مختلف پہلوؤں سے پیش کرتے ہیں' پھر بھی وہ کنارہ کشی کرتے ہیں۔''

ع ''اِک پھول کا مضموں ہو تو سو رنگ سے باندھوں'' کے مصداق ہم یہ سارے مضامین پھرا پھرا کر' مختلف انداز سے مختلف اسالیب سے ان کے سامنے لا رہے ہیں' مگر اس کے باوجود یہ لوگ اعراض کر رہے ہیں اور ایمان نہیں لا رہے۔

**آیت ۴۷** ﴿قُلْ اَرَءَيْتَكُمْ اِنْ اَتٰىكُمْ عَذَابُ اللّٰهِ بَغْتَةً اَوْ جَهْرَةً هَلْ يُهْلَكُ اِلَّا الْقَوْمُ الظّٰلِمُوْنَ﴾ ''(ان سے) کہیے دیکھو تو اگر تم پر عذاب آ جائے اچانک یا علی الاعلان' تو کون ہلاک ہوگا سوائے ظالموں کے؟''

یہ عذاب اچانک آئے یا بتدریج' پیشگی اطلاع کے بغیر وارد ہو جائے یا ڈنکے کی چوٹ اعلان کر کے آئے' ہلاک تو ہر صورت میں وہی لوگ ہوں گے جو رسولؑ کی دعوت کو ٹھکرا کر' اپنی جانوں پر ظلم کے مرتکب ہوئے ہیں۔ اب انبیاء و رُسل علیہم السلام کی بعثت کا وہی بنیادی مقصد بیان ہو رہا ہے جو اس سے پہلے ہم سورۃ النساء (آیت ۱۶۵) میں پڑھ چکے ہیں: ﴿رُسُلًا مُّبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ.....﴾



**آیت ۴۸** ﴿وَمَا نُرْسِلُ الْمُرْسَلِيْنَ اِلَّا مُبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ ۚ﴾ ''ہم نہیں بھیجتے رہے ہیں اپنے رسولوں کو مگر خوشخبری دینے والے اور خبردار کرنے والے بنا کر۔''

﴿فَمَنْ اٰمَنَ وَاَصْلَحَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ﴾ ''تو جو لوگ ایمان لے آئے اور انہوں نے اپنی اصلاح کر لی تو ان پر نہ کوئی خوف ہے اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔''

یعنی تمام انبیاء و رُسل اہلِ حق کے لیے بشارت دینے والے اور اہلِ باطل کے لیے خبردار کرنے والے تھے۔

**آیت ۴۹** ﴿وَالَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا يَمَسُّهُمُ الْعَذَابُ بِمَا كَانُوْا يَفْسُقُوْنَ﴾ ''اور وہ لوگ جنہوں نے ہماری آیات کو جھٹلایا ان پر عذاب مسلّط ہو کر رہے گا ان کی نافرمانی کے باعث۔''

**آیت ۵۰** ﴿قُلْ لَّآ اَقُوْلُ لَكُمْ عِنْدِيْ خَزَآئِنُ اللّٰهِ وَلَآ اَعْلَمُ الْغَيْبَ وَلَآ اَقُوْلُ لَكُمْ اِنِّيْ مَلَكٌ ۚ﴾ ''(اے نبی ﷺ ان سے) کہہ دیجیے کہ میں تم سے یہ نہیں کہتا کہ میرے اختیار میں ہیں اللہ کے خزانے اور نہ (میں نے دعویٰ کیا ہے کہ) مجھے غیب کا علم حاصل ہے اور نہ میں نے (کبھی) یہ کہا ہے کہ میں فرشتہ ہوں۔''

تم لوگ مجھ سے معجزات کے مطالبات کرتے ہو اور غیب کے احوال پوچھتے ہو' لیکن کسی شخص سے مطالبہ تو کیا جانا چاہیے اُس کے دعوے کے مطابق۔ میں نے کب دعویٰ کیا ہے کہ میں غیب جانتا ہوں اور الوہیت میں میرا حصہ ہے۔ میرا دعویٰ تو یہ ہے کہ میں اللہ کا ایک بندہ ہوں' بشر ہوں' مجھ پر وحی آتی ہے' مجھے مامور کیا گیا ہے کہ تمہیں خبردار کر دوں اور وہ کام میں کر رہا ہوں۔

﴿اِنْ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا يُوْحٰٓى اِلَيَّ ؕ﴾ ''میں تو بس اتباع کر رہا ہوں اس شے کی جو میری طرف وحی کی جاتی ہے۔''

﴿قُلْ هَلْ يَسْتَوِي الْاَعْمٰى وَالْبَصِيْرُ ؕ اَفَلَا تَتَفَكَّرُوْنَ﴾ ''کہیے تو کیا اب برابر ہو جائیں گے اندھے اور دیکھنے والے؟ تو کیا تم غور و فکر سے کام نہیں لیتے؟''

❁❁❁

# اسلام کا معاشی اور اقتصادی نظام

بانیٔ تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد رحمۃ اللہ علیہ

خطبۂ مسنونہ کے بعد:

اعوذ باللّٰہ من الشَّیطٰن الرَّجیم ۔ بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

وَالَّذِیۡنَ ہُمۡ لِلزَّکٰوۃِ فٰعِلُوۡنَ ۙ﴿۴﴾ (المؤمنون)

وَفِیۡۤ اَمۡوَالِہِمۡ حَقٌّ لِّلسَّآئِلِ وَالۡمَحۡرُوۡمِ ﴿۱۹﴾ (الذّٰریٰت)

وَیَسۡـَٔلُوۡنَکَ مَاذَا یُنۡفِقُوۡنَ ۬ؕ قُلِ الۡعَفۡوَ ؕ (البقرۃ:۲۱۹)

کَیۡ لَا یَکُوۡنَ دُوۡلَۃًۢ بَیۡنَ الۡاَغۡنِیَآءِ مِنۡکُمۡ ؕ (الحشر:۷)

اَوَ لَمۡ یَرَوۡا اَنَّ اللّٰہَ یَبۡسُطُ الرِّزۡقَ لِمَنۡ یَّشَآءُ وَیَقۡدِرُ ؕ اِنَّ فِیۡ ذٰلِکَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوۡمٍ یُّؤۡمِنُوۡنَ ﴿۳۷﴾ فَاٰتِ ذَا الۡقُرۡبٰی حَقَّہٗ وَالۡمِسۡکِیۡنَ وَابۡنَ السَّبِیۡلِ ؕ ذٰلِکَ خَیۡرٌ لِّلَّذِیۡنَ یُرِیۡدُوۡنَ وَجۡہَ اللّٰہِ ۫ وَاُولٰٓئِکَ ہُمُ الۡمُفۡلِحُوۡنَ ﴿۳۸﴾ وَمَاۤ اٰتَیۡتُمۡ مِّنۡ رِّبًا لِّیَرۡبُوَا۠ فِیۡۤ اَمۡوَالِ النَّاسِ فَلَا یَرۡبُوۡا عِنۡدَ اللّٰہِ ۚ وَمَاۤ اٰتَیۡتُمۡ مِّنۡ زَکٰوۃٍ تُرِیۡدُوۡنَ وَجۡہَ اللّٰہِ فَاُولٰٓئِکَ ہُمُ الۡمُضۡعِفُوۡنَ ﴿۳۹﴾ (الروم)

یٰۤاَیُّہَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰہَ وَذَرُوۡا مَا بَقِیَ مِنَ الرِّبٰۤوا اِنۡ کُنۡتُمۡ مُّؤۡمِنِیۡنَ ﴿۲۷۸﴾ فَاِنۡ لَّمۡ تَفۡعَلُوۡا فَاۡذَنُوۡا بِحَرۡبٍ مِّنَ اللّٰہِ وَرَسُوۡلِہٖ ۚ وَاِنۡ تُبۡتُمۡ فَلَکُمۡ رُءُوۡسُ اَمۡوَالِکُمۡ ۚ لَا تَظۡلِمُوۡنَ وَلَا تُظۡلَمُوۡنَ ﴿۲۷۹﴾ (البقرۃ)



## تمہیدی کلمات

''اسلام کا نظامِ حیات'' کے موضوع پر سلسلہ وار خطابات کے ضمن میں آج پانچواں اور آخری خطاب ہے‘ جس کا عنوان ہے: ''اسلام کا معاشی اور اقتصادی نظام''۔ اس سے پہلے اس سلسلہ کے چار خطابات ہو چکے ہیں: (i) ''اسلامی نظام کی نظریاتی اساس: ایمان'' (ii) ''اسلام کا اخلاقی اور روحانی نظام'' (iii) ''اسلام کا سماجی اور معاشرتی نظام'' (iv) ''اسلام کا سیاسی اور ریاستی نظام'' —— آج ایک اعتبار سے بہت خوشی محسوس ہو رہی ہے کہ یہ سلسلہ بحمد اللہ تکمیل کو پہنچا۔ ع شکر صد شکر کہ جمازہ بمنزل رسید! لیکن اس کے ساتھ ساتھ ایک خصوصی تشویش بھی ہے کہ آج ہم اسلامی نظامِ حیات کے جس گوشے سے متعلق گفتگو کرنے جا رہے ہیں وہ سب سے زیادہ پیچیدہ بھی ہے‘ اختلافی بھی ہے‘ مشکل بھی ہے اور سب سے زیادہ اہم بھی ہے۔ ایک طرف تو یہ بات معروف اور مسلم حقیقت کے طور پر لوگوں کے علم میں ہے کہ دورِ حاضر درحقیقت اقتصادیات کا دور ہے اور ساری بین الاقوامی سیاست اقتصادیات کے گرد گھوم رہی ہے۔ قومی اور عالمی سطح پر جتنے بھی معاملات ہیں ان میں سب سے بڑا اور فیصلہ کن عامل معاشی اور اقتصادی ہے۔ الغرض خواہ ملکوں کے اپنے اندرونی معاملات ہوں‘ قومی مسائل ہوں‘ بین الاقوامی سیاست ہو یا بین الاقوامی معاملات‘ ان سب میں سب سے زیادہ مؤثر عامل اقتصادی اور معاشی ہے۔ دوسری طرف یہ بھی ایک مسلّم حقیقت ہے کہ آج کے انسان کو بنیادی طور پر معاشی یا اقتصادی حیوان قرار دیا جائے تو غلط نہیں ہوگا۔ ایک دور تھا جس میں عقلیات‘ فلسفہ اور منطق کا بڑا دور دورہ تھا اور لوگوں کی کثیر تعداد ادھر متوجہ تھی۔ اُس دور میں یہ علوم سب سے اعلیٰ شمار ہوتے تھے اور ذہین ترین لوگ انہی کی طرف متوجہ ہوتے تھے۔ اُس دَور میں انسان کو حیوانِ عاقل اور حیوانِ ناطق سے تعبیر کیا گیا۔ لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ آج کا انسان ایک معاشی اور اقتصادی حیوان بن کر رہ گیا ہے۔ اس ضمن میں اسلامی تعلیمات کے کچھ پہلو بعض اسباب کی بنا پر دورِ خلافت راشدہ کے فوراً بعد دورِ ملوکیت کے آغاز پر پس منظر میں چلے گئے تھے اور عمومی طور پر لوگوں کی نگاہوں کے سامنے نہ رہے۔ آج معاشی اور اقتصادی مسئلے کی شدت کا ایک مثبت اور خیر و برکت کا پہلو یہ ہے کہ اس دور میں وہ پوشیدہ پہلو از سرِ نو نمایاں ہو رہے ہیں اور ان کی طرف لوگوں کی توجہ مجبوراً ہو رہی ہے۔

## اس دور میں شاید وہ حقیقت ہو نمودار!

بیسویں صدی کے مسلم مفکرین میں میں سب سے زیادہ علامہ اقبال کی صحتِ فکر اور جامعیتِ فکر کا قائل ہوں۔ میں نے پچھلے خطابات میں بھی علامہ اقبال کے درج ذیل اشعار پڑھے تھے اور آج بھی اُن کو دہرا رہا ہوں‘ اس لیے کہ اُن میں بڑی عظیم حقیقت بیان ہوئی ہے ؎

ہر کجا بینی جہانِ رنگ و بو
زانکہ از خاکش بروید آرزو
یا ز نورِ مصطفیٰ او را بہاست
یا ہنوز اندر تلاشِ مصطفیٰ است!

میں سمجھتا ہوں کہ اس سے زیادہ گھمبیر اور جامع تعبیر ممکن نہیں ہے کہ حضور ﷺ کے بعد نوعِ انسانی میں جتنا بھی معاشرتی‘ ذہنی اور فکری ارتقاء ہوا ہے اور اس ضمن میں جو بھی خیر انسان نے پچھلے ایک ہزار سال کے دوران حاصل کیا ہے‘ اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ درحقیقت اس ہدایتِ آسمانی سے مستعار ہے جو محمدؐ رسول اللہ ﷺ پر اپنے نقطۂ عروج اور نقطۂ تکمیل کو پہنچ گئی تھی۔ ازروئے الفاظِ قرآنی:

﴿یُرِیْدُوْنَ اَنْ یُّطْفِـُٔوْا نُوْرَ اللّٰهِ بِاَفْوَاهِهِمْ وَیَاْبَى اللّٰهُ اِلَّاۤ اَنْ یُّتِمَّ نُوْرَهٗ وَلَوْ كَرِهَ الْكٰفِرُوْنَ ۝۳۲ هُوَ الَّذِیْۤ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّیْنِ كُلِّهٖ ۙ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ ۝۳۳﴾ (التوبۃ)

’’وہ چاہتے ہیں کہ بجھا دیں اللہ کی روشنی (نور) کو اپنے منہ (کی پھونکوں) سے جبکہ اللہ اپنی روشنی کو پورا کیے بغیر نہیں رہے گا اگرچہ کافر ناپسند کریں۔ اسی (اللہ) نے بھیجا اپنے رسول کو ہدایت اور سچا دین دے کر تاکہ اس (دین) کو ہر دین پر غالب کر دے‘ اگرچہ مشرک اس کو ناپسند کریں۔‘‘

یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک تحدّی کا (challenging) انداز ہے اور ظاہر بات ہے کہ اللہ کے چیلنج کا کون مقابلہ کر سکتا ہے؟ چنانچہ وہ بات پوری ہو کر رہی: ﴿جَآءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ ؕ اِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوْقًا ۝۸۱﴾ (الاسراء) ’’حق آ گیا اور باطل بھاگ (مٹ) گیا۔ یقیناً باطل ہے ہی بھاگنے (مٹنے) والا‘‘۔ اور اس کا اعلان سورۃ المائدۃ میں بایں الفاظ میں کر دیا گیا:

﴿اَلْیَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِیْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَیْكُمْ نِعْمَتِیْ وَرَضِیْتُ لَكُمُ



الْاِسْلَامَ دِیْنًا ؕ﴾ (المائدۃ:۳)

’’آج کے دن میں نے تمہارے لیے تمہارے دین کو کامل کر دیا ہے اور تم پر اپنی نعمت کا اِتمام فرما دیا ہے اور تمہارے لیے میں نے پسند کر لیا ہے اسلام کو بحیثیت دین کے۔‘‘

یہ معاملہ دَورِ نبوی اور دَورِ خلافتِ راشدہ میں ایک حقیقتِ واقعی کی صورت میں دنیا کے سامنے آیا۔ اسلام کے غلبے اور اسلامی نظام کے بالفعل قیام کی جو جھلک انسان نے اُس وقت دیکھی تھی‘ میں نے اس کے بارے میں بارہا کہا ہے کہ وہ ایک حسین خواب کی مانند ہے۔ ہم میں سے کوئی شخص کبھی بہت اچھا خواب دیکھے تو وہ بہت عرصے تک اس کی یادداشت میں محفوظ رہتا ہے اور اس کی یاد بار بار آتی ہے۔ اسی طرح دورِ نبویؐ اور دورِ خلافت راشدہ پوری انسانیت کی اجتماعی یادداشت میں ایک حسین خواب کی یاد کی حیثیت سے محفوظ ہے اور نوعِ انسانی درحقیقت اسی کو realize کر رہی ہے۔

علامہ اقبال نے بھی ان اشعار میں اس حقیقت کو بیان کیا ہے کہ دنیا میں جہاں بھی کوئی خیر یا خوبی ہے‘ کوئی اعلیٰ قدر ہے‘ چاہے نظامِ عدالت کی ہو‘ نظامِ حکومت کی ہو یا کسی اقتصادی نظام کی‘ وہ درحقیقت یا تو محمد ﷺ سے مستعار لی گئی ہے یا ابھی انسان گھسٹ گھسٹ کر اسی منزل کی طرف جا رہا ہے جس منزل پر آج سے چودہ سو سال قبل محمدؐ رسول اللہ ﷺ نے انسانیت کو پہنچا دیا تھا۔

موجودہ دور میں عمرانیات کا جو ارتقاء ہوا ہے اور حالات کی شدت کے نتیجے میں معاشی میدان میں خیر کے جو پہلو سامنے آنا شروع ہوئے ہیں‘ اس کا اظہار علامہ اقبال نے اس طرح کیا ہے: ؎

جو حرفِ قُلِ الْعَفْو میں پوشیدہ تھی اب تک
اس دور میں شاید وہ حقیقت ہو نمودار!

اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ وہ حقائق کبھی نمودار ہی نہیں ہوئے تھے بلکہ وہ پورے طور پر دورِ نبوی اور دورِ خلافتِ راشدہ میں جلوہ آرا ہوئے تھے‘ البتہ اس کے بعد اس پر پردے پڑ گئے اور وہ پس منظر میں چلے گئے۔ اب موجودہ حالات کا تقاضا ہے کہ وہ حقائق دوبارہ سامنے آئیں۔ اس حوالے سے میرے نزدیک علامہ اقبال کی نظم ’’ابلیس کی مجلس شوریٰ‘‘ کا خاص طور پر آخری حصّہ جامعیت کے اعتبار سے انتہائی اہم ہے۔

جہاں تک شعریت‘ جذبات اور سوز و ساز کا تعلق ہے اس اعتبار سے علامہ کی دوسری نظمیں بہت بلند ہیں‘ لیکن علامہ اقبال کا پیغام اُمّتِ مسلمہ کے نام‘ کے موضوع پر میرے

نزدیک حرف آخر اور کلائمکس یہ نظم ''ابلیس کی مجلس شوریٰ'' ہے۔ اس میں علامہ نے اپنی سوچ کا خلاصہ اور لُبِّ لباب اُمت مسلمہ کے سامنے رکھ دیا ہے۔ اس کے چند اشعار ملاحظہ کیجیے۔ ابلیس اپنی مجلس مشاورت کو اختتام پذیر (conclude) کرتے ہوئے کہتا ہے:

عصرِ حاضر کے تقاضاؤں سے ہے لیکن یہ خوف
ہو نہ جائے آشکارا شرعِ پیغمبر کہیں!
الحذر آئینِ پیغمبر سے سو بار الحذر
حافظِ ناموسِ زن' مرد آزما' مرد آفریں!

آپ نوٹ کیجیے کہ ایک مصرعہ میں اسلام کے عائلی اور معاشرتی نظام کا لب لباب اور اس کا اہم ترین پہلو بیان ہو گیا ہے۔ اس مصرعہ میں تین معاشرتی پہلوؤں کا تذکرہ ہے: (i) حافظِ ناموسِ زن' یعنی اسلام کا معاشرتی نظام عورت کی عزت اور عصمت کا محافظ ہے۔ (ii) مرد آزما' یعنی اسلام نے معاش کی ذمہ داری مرد پر ڈالی ہے۔ (iii) مرد آفریں' یعنی ملکی دفاع بھی مَردوں کی ذمہ داری ہے۔

موت کا پیغام ہر نوعِ غلامی کے لیے
نے کوئی فغفور و خاقاں' نے فقیرِ رہ نشیں!

یہ اسلام کے سیاسی نظام کا لبِّ لباب اور خلاصہ ہے کہ ہر نوع کی غلامی ختم' یعنی نہ کوئی حاکم نہ محکوم اور نہ کوئی آقا نہ کوئی غلام۔ اسلام ''حریّتِ کاملہ'' کا تصور دیتا ہے کہ انسان ہونے کے ناطے سب برابر ہیں ع ''تمیزِ بندہ و آقا فسادِ آدمیت ہے!'' انسان انسان کا غلام اور انسان انسان کے تابع ہو' اسلام اس تصور کی نفی کرتا ہے۔ بندوں سے صرف اللہ کی عبدیت کا مطالبہ ہے۔

اس کے بعد دو اشعار میں معاشی اور اقتصادی نظام کا تذکرہ ہے جو ہمارا آج کا موضوع ہے:

کرتا ہے دولت کو ہر آلودگی سے پاک وصاف
منعموں کو مال و دولت کا بناتا ہے امیں!
اس سے بڑھ کر اور کیا فکر و عمل کا انقلاب
پادشاہوں کی نہیں' اللہ کی ہے یہ زمیں!

یعنی اسلام دولت کو تمام آلودگیوں سود' جوا اور سٹہ وغیرہ سے پاک کرتا ہے اور مالداروں کو یہ احساس دلاتا ہے کہ جو کچھ تمہارے پاس ہے تم اس کے مالک نہیں بلکہ امین ہو۔ دوسرے مصرعہ میں مسئلہ ملکیت زمین کا تذکرہ ہے کہ زمین اللہ کی ملکیت ہے۔ اس اعلیٰ نظامِ حیات کے بارے



میں ابلیس کو اندیشہ ہے کہ کہیں دنیا کے سامنے دوبارہ آشکارا نہ ہو جائے۔ پھر ظاہر بات ہے کہ ابلیس اور ابلیسیّت کے لیے اس دنیا میں کھل کھیلنے کا کوئی امکان باقی نہیں رہے گا۔

## اسلام کے معاشی نظام پر گفتگو کرنے کی اہلیّت

ایک طرف تو اس موضوع کی اہمیت کا یہ عالم ہے کہ موجودہ دور کو معاشیات کا دور کہا جاتا ہے۔ دوسری طرف میرے سامنے یہ حقیقت الحمدللہ پوری طرح واضح ہے کہ اصولاً اس موضوع یعنی اسلام کے معاشی اور اقتصادی نظام پر گفتگو کا حق اس شخص کو حاصل ہے جس نے ایک تو جدید معاشیات اور اقتصادیات کا طالب علمانہ مطالعہ کیا ہو' اس میں مہارتِ تامّہ بہم پہنچائی ہو اور اس کی پیچیدگیاں جانتا ہو۔ دوسرے یہ کہ قرآن و حدیث' فقہ اور اسلام کے نظامِ فکر کی بڑی باریکیوں تک اس کی نگاہ پہنچی ہو۔ یہ دونوں چیزیں اگر کسی شخص میں نہیں ہیں تو اس کو اس موضوع پر گفتگو کا حق نہیں ہے۔ میں صاف اعتراف کرتا ہوں کہ میں ان دونوں اعتبارات سے بالکل تہی دست اور تہی دامن ہوں۔ میں کبھی بھی معاشیات کا طالب علم نہیں رہا اور میں نے باقاعدہ اس کی تحصیل نہیں کی' اس کے علاوہ جدید معاشیات و اقتصادیات کے جو پیچیدہ مسائل ہیں ان سے میں سرے سے نابلد ہوں۔ مالی (fiscal) معاملات' مانیٹری سسٹم' بینکنگ اور فنانس' بڑے پیچیدہ اور مشکل مسئلے ہیں۔ پوری پوری زندگیاں ان میں کھپائی جائیں تو پتا چلتا ہے کہ ان کی باریکیاں' نزاکتیں اور مشکلات کیا ہیں' ان کے مسائل کیا ہیں اور ان کا حل کیا ہے۔ میں اپنے بارے میں زیادہ سے زیادہ یہ کہہ سکتا ہوں کہ میں قرآن حکیم کا طالب علم ہوں اور کسی حد تک حدیث نبوی کا' جبکہ فقہ کا میں نے باضابطہ مطالعہ کیا ہی نہیں۔ گویا ان دونوں شرائط کے اعتبار سے میں اس موضوع پر گفتگو کرنے کا اہل نہیں ہوں۔

پھر سوال پیدا ہو رہا ہے کہ اس کے باوجود میں اس موضوع پر لب کشائی کی جسارت کیوں کر رہا ہوں؟ اس کی دو وجوہات ہیں۔ اولاً یہ کہ معاشیات اور اقتصادیات کے مبادی اور اسلام نے اُن کے لیے جو بنیادی ہدایات اور راہنمائی دی ہے' قرآن مجید کے طالب علم ہونے کے ناطے' الحمدللہ ثم الحمدللہ' اس میں اللہ تعالیٰ نے مجھے پورا انشراح عطا فرمایا ہے اور ثانیاً یہ کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے عقلِ عام (common sense) سے بہرہ ور فرمایا ہے۔ یہ شاید ایک دعویٰ ہو لیکن بہرحال اس دعوے کی میں جرأت یا جسارت کر رہا ہوں۔ ان دو چیزوں کی بنیاد پر میں یہ سمجھتا ہوں کہ لوگوں کے ذہنوں میں معاشیاتِ اسلامی سے متعلق جو بعض الجھنیں

(confusions)' پیچیدگیاں اور خلط مبحث کی نوعیت کی جو چیزیں ہیں' شاید ان کے حل کرنے میں کسی حد تک میں بھی کچھ مدد کر سکوں۔ ظاہر بات ہے کہ اس کے بعد اس کو آگے بڑھانا تو ان حضرات کا کام ہے جو اس کے لیے پوری زندگیاں لگائیں۔ ایک طرف کسی ایک یونیورسٹی سے نہیں بلکہ متعدد یونیورسٹیوں سے معاشیات میں ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کریں اور دوسری طرف انہوں نے واقعتاً قرآن وسنت اور فقہ اسلامی کا بڑا گہرا مطالعہ کیا ہو۔

لاہور میں ہم نے جو قرآن اکیڈمی قائم کی ہے ابھی وہ ابتدائی مراحل میں ہے' لیکن یہ کام ہمارے پیش نظر ہے۔ آپ دعا کریں کہ کچھ نوجوان اس کے لیے کمرِ ہمت کس لیں۔ اس ضمن میں اہم ترین کام تو یہ ہے کہ جن حضرات کی ساری عمر دین کے پڑھنے پڑھانے میں گزری ہے اب وہ جدید اقتصادیات کو سمجھنے کی کوشش کریں۔ دوسرے درجے میں جن لوگوں نے ساری عمر اقتصادیات کا مطالعہ کیا ہے اب وہ قرآن وحدیث اور فقہ کو بھی پڑھیں۔ یہ دوسری چیز بھی بہرحال **مالا یُدرک کُلّہ لا یُترک کُلّہ** کے درجے میں قابل قبول ہے۔ لیکن اصلاً یہ کام ان لوگوں کے ذریعے ہو سکے گا جو ابتدا ہی سے متوازن اور متوازی طور پر ان دونوں چیزوں کا مطالعہ کر رہے ہوں۔ اس سے درحقیقت ذہن کی وہ تربیت وجود میں آئے گی جو ہر سطح پر ذہنی وفکری توافق وہم آہنگی (integration) کے تمام تقاضوں کو پورا کر سکے گی۔ بہرحال کسی اعلیٰ مقصد کے لیے اگر ابتدا بھی کر دی جائے تو وہ بھی ایک کرنے کا کام ہے۔ ہم نے اس کا ارادہ کیا ہے' اللہ تعالیٰ اسے پورا کروائے۔

اس طرح کے عمومی اجتماعات میں پوری بحث کو بنیاد سے اٹھانا اور بنیادی تصورات (concepts) اور بنیادی اصطلاحات (terminology) کی وضاحت سے گفتگو شروع کرنا ممکن نہیں ہوتا۔ آج میں نے خاص طور پر عرض کیا کہ میں اقتصادی اور معاشی نظام کے بارے میں تو گفتگو کرنے کا اہل بھی نہیں ہوں' اس لیے میں اس ضمن میں تفہیم کا آسان راستہ اختیار کروں گا۔ جیسے کہ میں نے اسلام کے سیاسی نظام پر گفتگو کرتے ہوئے بھی ایک آسان راستہ اختیار کیا تھا کہ سیاسی نظام سے متعلق بعض اصطلاحات ہمارے ذہنوں میں موجود ہیں اور ہمارا عام پڑھا لکھا آدمی جانتا ہے کہ ملوکیت (monarchy)' پاپائیت (theocracy) اور جمہوریت (democracy) کا کیا مفہوم ہے۔ چنانچہ اگر کسی نے تھیوڈیموکریسی کی اصطلاح وضع کی تو اس کے حوالے سے بات سمجھانے میں آسانی ہوئی۔ اسی طرح اِس وقت بھی میرے



سامنے آسان راستہ یہ ہے کہ معاشیات اور اقتصادیات سے متعلق وہ اصطلاحات جو معروف ہیں اور عام لوگ اس سے واقف ہیں' ان کے حوالے سے بات کروں تاکہ بات فوراً سمجھ میں آ جائے' مثلاً سرمایہ داری (capitalism) ایک زندہ حقیقت اور ایک زندہ نظام کی حیثیت سے دنیا کے بہت بڑے رقبہ پر بالفعل قائم ہے اور ایک بڑی سپر پاور اس کی علمبردار ہے۔ وہ ایک جانی پہچانی حقیقت ہے اور اس کے اصول ومبادی لوگوں کے علم میں ہیں۔ دوسری طرف اشتراکیت (communism) بھی اس صدی کی ایک بہت بڑی حقیقت ہے۔ روس میں اس کا آغاز ہوا' اگرچہ اس میں کئی تبدیلیاں بھی آ رہی ہیں' لیکن کمیونزم کیا ہے' اس کے معنی کیا ہیں' اس سے مراد کیا ہے' اس کے اصول ومبادی کیا ہیں' یہ بہرحال ہمارے عام پڑھے لکھے لوگوں کے علم میں ہے۔ اکثر وبیشتر لوگ جانتے ہیں کہ یہ دو نظام ہائے معیشت ہیں جو اس وقت بالفعل دنیا میں قائم ہیں۔ اگر ہم ان اصطلاحات کو مدنظر رکھتے ہوئے گفتگو کریں گے تو' ان شاء اللہ' اسلام کے نظامِ معیشت کو سمجھنے میں سہولت ہوگی اور آسانی کے ساتھ ہم اسلامی نظام حیات کے آخری مرحلے کو طے کر سکیں گے۔

## سرمایہ داری اور اشتراکیت کا تقابلی جائزہ

میں نے اسلام کے معاشرتی نظام پر گفتگو کرتے ہوئے عرض کیا تھا کہ یہ دو معاشی نظام (سرمایہ داری اور اشتراکیت) جو دنیا میں موجود ہیں' ان دونوں میں سے ہر ایک کا ایک نمائندہ لفظ (catch word) ہے جو اس نظام کے مرکزی خیال کی نمائندگی کرتا ہے۔ یعنی سرمایہ دارانہ نظام کا نمائندہ لفظ آزادی (freedom) اور اشتراکیت کا مساوات (equality) ہے۔ یہ دونوں ہی اعلیٰ اقدار ہیں اور ضمیر انسانی دونوں ہی کو پسند کرے گا۔ زیادہ اونچ نیچ کسی کو بھی پسند نہیں اور اسی طرح قدغنیں اور پابندیاں بھی کوئی پسند نہیں کرتا۔ البتہ مشکل یہی ہے کہ خود ان دونوں نظاموں میں عدل واعتدال اور توازن وہ شے ہے جس کی تلاش میں انسان سرگرداں ہے' مختلف قسم کے تجربے کر رہا ہے' افراط وتفریط کے دھکوں سے اِدھر سے اُدھر جا رہا ہے' لیکن بہرحال انسان اس نقطۂ اعتدال کا متلاشی ہے کہ جس میں یہ دونوں چیزیں (آزادی اور مساوات) سمو دی جائیں۔ ان ہی کوششوں کا ایک نتیجہ سوشلسٹ ویلفیئر سٹیٹ کا تصور ہے' جس کی سب سے بڑی نمائندگی سیکنڈے نیوین ممالک کر رہے ہیں جہاں وہ نظام ان دونوں کے ملاپ (synthesis) کی شکل میں سامنے آیا ہے۔

ان دونوں نظاموں کی بدبختی یہ ہے کہ ایک میں آزادی ہے مساوات نہیں اور دوسرے میں مساوات ہے آزادی نہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ امریکہ میں آپ بحری جہاز سے ساحل پر اتریے یا ہوائی جہاز سے ایئرپورٹ پر اتریے' آپ کو فوراً محسوس ہوگا کہ یہاں آزادی ہے' اس کی فضا میں آزادی رچی بسی ہے۔ وہاں حکومت تقریباً غیر مرئی (invisible) محسوس ہوتی ہے۔ زیادہ سے زیادہ ہم پاکستانیوں کے لیے ایک مصیبت امیگریشن کی ہے' اس کے بعد آپ وہاں گھومیں پھریں تو اس کی فضا میں آزادی محسوس کریں گے۔ لیکن یہ آزادی مساوات کی قیمت پر حاصل ہوئی ہے۔ ایک قوم تہذیب وتمدن اور آزادی کے اعتبار سے اتنی بلندی پر ہے' لیکن دوسری طرف آپ کو نظر آجائے گا کہ مین ہیٹن میں ایسے اقلیتی محلّے (ghettos) موجود ہیں جہاں انسان حیوانی سطح پر زندگی گزار رہے ہیں' حالانکہ اسی کے جنوبی کنارے پر وہ وال سٹریٹ ہے کہ جہاں دُنیا کی دولت کا بہت بڑا حصہ مرتکز ہے۔ وہاں پر آپ کو یہ فرق و تفاوت بالکل نمایاں نظر آجائے گا کہ ایک طرف وہ لوگ ہیں جن کی دولت کا کوئی اندازہ ہی نہیں' انہیں خود نہیں معلوم کہ ان کے پاس کتنی دولت ہے اور ایک طرف اسی مملکت کے وہ شہری ہیں جو خاص طور پر رات کے وقت زیرزمین راستوں اور ٹرینوں میں کیا کیا حرکتیں کرتے پھرتے ہیں اور شراب کی ایک بوتل کے لیے انسانی جان کے ساتھ کھیل جاتے ہیں۔ آپ کو یہ فرق وتفاوت عام نظر آئے گا' البتہ وہاں آزادی ہے اس میں کوئی شک نہیں۔ دوسری بات یہ کہ ایسی کامل مساوات کہ سب بالکل برابر ہو جائیں' یہ انہونی سی بات ہے جس کا کوئی تصور ممکن ہی نہیں ہے۔ لیکن یہ بہرحال ماننا پڑے گا کہ کمیونزم نے اس فرق وتفاوت کو بہت حد تک کم کیا ہے' لیکن یہ مساوات آزادی کی قیمت پر حاصل ہوئی ہے۔ آزادی کی وہ چڑیا ہاتھ سے جاتی رہی ہے جس کے لیے سفر کبھی شروع کیا گیا تھا۔

اس تمدنی ارتقاء کے سفر کو اگر ہم پچھلی دو تین صدیوں میں تلاش کریں تو اس کی ابتدا اور شروعات کا پتا چلے گا۔ پہلے ملوکیت اور جاگیرداری کا دور تھا۔ پوری دنیا میں' یورپ اور ہندوستان سمیت' بادشاہت اور جاگیرداری ایک عالمگیر نظام کی حیثیت سے رائج تھی۔ ہمارے ہاں بھی بادشاہ سلامت کے نیچے بیس ہزاری' تیس ہزاری منصب دار ہوتے تھے اور برطانیہ عظمیٰ میں بھی بادشاہ معظم کے نیچے لارڈز اور بیرنز (barons) ہوا کرتے تھے' جو عوام کا خون نچوڑتے تھے۔ انسان نے اس محکومی سے اور اس ''تمیز بندہ وآقا فسادِ آدمیت'' سے نکلنے کے



لیے چھلانگ لگائی اور اس کے لیے بڑی محنت کی۔ بادشاہوں کے خدائی حقوق (Divine rights of the Kings) اور جاگیرداروں کے تسلّط سے آزادی حاصل کرنا کوئی آسان کام نہیں تھا' انسان نے اس کے لیے بڑی محنت کی' قربانیاں دیں' تب جا کر آزادی حاصل ہوئی اور پھر جمہوریت آئی' آزادی کا سورج طلوع ہوا' لیکن اس آزادی نے اقتصادیات کے راستے سے سرمایہ داری (capitalism) کی شکل اختیار کر لی اور پھر آزادی ختم ہوگئی' بایں معنی کہ پہلے جاگیردار مسلّط تھا اب سرمایہ دار مسلّط ہوگیا۔ اس طرح آزادی کی چڑیا پھر بھی ہاتھ نہ آئی۔ اسی کے ردعمل کے طور پر کمیونزم نے آزادی کے حصول کے لیے اور اس سرمایہ دارانہ نظام کی لعنت سے نجات پانے کے لیے چھلانگ لگائی۔ ان کو تھوڑی بہت کامیابی ملی اور کسی درجے میں اس سرمایہ داری کی لعنت سے نجات مل گئی' لیکن پارٹی ڈکٹیٹرشپ اور یک جماعتی ریاست (totalitarian state) سے وہ آزادی کی چڑیا پھر ہاتھ سے نکل گئی۔ یہ اس پورے افراط وتفریط کے دھکوں کے سفر کا خلاصہ ہے جس سے پوری نوعِ انسانی گزری ہے۔

ہمارے ہاں آزادی کا یہ سفر ابھی چل رہا ہے۔ میں ایک مثال دیا کرتا ہوں کہ نظریۂ ارتقاء کی رو سے (unicellular organism) سے نوعِ انسانی (homo sapiens) تک کا جو سفر لاکھوں کروڑوں سالوں میں طے ہوا ہے' رحم مادر میں وہی سفر نو مہینے میں طے ہو جاتا ہے۔ اسی طرح وہ پورا process جو یورپ اور مغرب میں صدیوں میں طے ہوا' اب ہمارے ہاں جس کو آپ ''تیسری دنیا'' (third world) کہتے ہیں' وہی سفر چند سالوں کے اندر طے ہو رہا ہے۔ ہم بھی اسی مرحلے سے گزر رہے ہیں' ہمارے ہاں بھی جاگیرداری اور وڈیرہ شاہی نظام اب ٹوٹ پھوٹ رہا ہے اور اس کی جگہ پر جمہوریت اُبھر رہی ہے اور پھر جمہوریت کی اگلی منزل وہی آزادی ومساوات کا نقطۂ اعتدال ہے جو اسلامی نظام کا مرکزی خیال ہے۔ اس process کو اگر آپ نے اسلام کے رخ کی طرف نہ موڑا تو پھر آپ کا سفر بھی مغرب کی طرح طویل ہوتا جائے گا۔ اور حقیقت یہ ہے کہ ہمارے ہاں ابھی تک اسلامی معیشت کی طرف رُخ کی تبدیلی کا معاملہ کہیں ہو نہیں پایا۔ یہ ہمارے ذہنوں میں' ہماری تحریروں میں' ہمارے دعووں میں' ہمارے مقالات میں اور ہمارے نعروں میں تو ہے' لیکن زمین پر کسی جگہ پر بالفعل اس کی حقیقت کا کوئی ظہور موجود نہیں ہے۔

یہاں یہ بات بھی نوٹ کر لیں جو میں نے اپنے گزشتہ خطاب ''اسلام کا سماجی اور

معاشرتی نظام'' میں بڑے مفصّل اور مدلّل انداز میں بیان کی تھی کہ اگر ہم اسلامی نظام کا مرکزی خیال (basic theme) معیّن کرنا چاہیں تو وہ ہے عدل وقسط' انفرادی اخلاق میں بھی اور اجتماعی نظام میں بھی۔ یوں سمجھئے کہ اسلام آزادی اور مساوات کے درمیان بھی عدل قائم کرتا ہے تاکہ نہ آزادی اتنی بڑھ جائے کہ مساوات کو بالکل ہڑپ کر جائے اور نہ ہی مساوات کا ہوا اتنا بڑھ جائے کہ وہ آزادی کو بالکل نگل جائے۔ اسلام کا مرکزی تصور عدل ہے اور وہ اس عدل کو زندگی کے ہر گوشہ میں نافذ کرتا ہے۔

اسلام کے نظامِ معیشت کو بیان کرنے سے پہلے ہم قدیم نظامِ معیشت سرمایہ داری اور اشتراکیت کے فرق کو واضح کرتے ہیں۔ سرمایہ دارانہ نظام میں ذاتی ملکیت (private ownership) کا تصور ہے' جو نہ صرف زیرِ استعمال اشیاء (articles of use) بلکہ ذرائع پیداوار (means of production) کو بھی محیط ہے۔ جبکہ کمیونزم کا آغاز تو اس عزم سے ہوا تھا کہ انفرادی ملکیت سرے سے ہونی ہی نہیں چاہیئے' سب کچھ قومی ملکیت ہو' لیکن انتہا پر پہنچنے کے بعد رفتہ رفتہ وہ اپنے نشاناتِ قدم پر واپس پلٹے ہیں اور وہ بھی زیرِ استعمال اشیاء کی ذاتی ملکیت کے قائل ہو گئے ہیں۔ بلکہ وہ تو کچھ اور incentive بھی دے رہے ہیں' کسی حد تک انٹرسٹ بھی دوبارہ وہاں آ رہا ہے۔ لیکن کمیونزم کا اصل الاصول یہ ہے کہ ذرائع پیداوار (means of production) جن سے پیداوار حاصل کی جائے' جن سے نفع حاصل کیا جائے' چاہے وہ کھیت ہو' دکان ہو' کارخانہ ہو' انفرادی ملکیت میں نہیں ہوں گے بلکہ قومی ملکیت میں ہوں گے۔

اب اس کا نتیجہ کیا نکلتا ہے' اس پر غور کریں۔ انسان کی ایک جبلت ہے کہ جو شے اُس کی ذاتی ملکیت ہو' اسے معلوم ہو کہ یہ میری شے ہے وہ اس میں ترقی کے لیے محنت کرتا ہے' کوشش کرتا ہے۔ اس کو آپ ذاتی حوصلہ مندی (personal incentive) کا نام دیتے ہیں کہ میں محنت کر رہا ہوں' بھاگ دوڑ کر رہا ہوں' مجھے اُمید ہے کہ اس سے میں جو کچھ بھی حاصل کروں گا وہ میرا ہو گا اور پھر میرے بعد میری اولاد کو بھی منتقل ہو جائے گا۔ چنانچہ انفرادی ملکیت کے تصور سے اس میں کام کرنے کا جذبہ زیادہ پیدا ہوتا ہے۔ یہ وہ جبلتیں (animal instincts) ہیں جن کو ہمیں تسلیم کرنا چاہیے۔ لہٰذا انفرادی ملکیت میں پیداوار (production) زیادہ ہے' اقتصادی ترقی تیز ہے' البتہ اس کا نتیجہ عدم مساوات کی صورت میں نکلتا ہے اور امیر وغریب کے مابین فرق بڑھتا چلا جاتا ہے۔ سرمایہ داری کا اصول یہ ہے کہ ملازموں کو رکھنے یا فارغ کرنے



(hire and fire) کا پورا اختیار سرمایہ دار (capitalist) کے پاس ہونا چاہیے' ورنہ وہ نظام نہیں چل سکتا۔ یہ جو بیچ بیچ کا نظام ہے اس میں سوائے تصادم کے کچھ حاصل نہیں ہو سکتا۔ سرمایہ دار کہتا ہے کہ میرا کارخانہ ہے' آپ کام کرنا چاہتے ہیں تو میں اتنی اُجرت دوں گا' آپ اس اجرت پر کام کرنا چاہتے ہیں تو کیجیے اور اگر آپ اپنا کام ٹھیک نہیں کر رہے تو مجھے اختیار ہونا چاہیے کہ میں فوراً اسی وقت آپ کو گیٹ سے باہر نکال دوں۔ اس نظام میں یقیناً پیداوار زیادہ ہو گی' لیکن haves and have-nots کا فرق وتفاوت بڑھتا چلا جائے گا۔

دوسری طرف اگر ہر چیز قومی ملکیت میں ہو تو پیداوار کم ہو گی' کیونکہ آدمی کی ذاتی ملکیت نہیں ہے' ذاتی مفاد نہیں ہے تو وہ کیوں زیادہ کام کرے؟ وہ تو مارے باندھے کو کام کرے گا۔ اس کے اوپر سپرویژن ہو گی یا کوئی کم از کم معیار مقرّر کر دیا جائے گا کہ اس سے کم کام کیا تو جرمانہ یا سزا ہو گی' تو جرمانہ یا سزا کے خوف سے تو کام کرے گا' لیکن خود اس میں جذبہ نہیں اُبھرے گا کہ وہ زیادہ محنت کرے' زیادہ مشقت کرے' تاکہ زیادہ پیداوار ہو۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ اس قومی ملکیت کے تصور میں haves and have-nots کا فرق وتفاوت بہت کم ہو گا جو سرمایہ دارانہ نظام میں بہت زیادہ ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مصدّقہ اعداد وشمار کے حوالے سے اس میں کسی شک وشبہ کی گنجائش نہیں کہ زرعی رقبہ اشتراکیت کے علمبردار روس کے پاس زیادہ ہے لیکن پیداوار سرمایہ دارانہ نظام کے علمبردار امریکہ میں زیادہ ہوتی ہے۔ امریکہ غذائی اجناس برآمد کرتا ہے جبکہ روس درآمد کرتا ہے۔ اگرچہ سائنسی تحقیق کے میدان میں تو روس نے کندھے سے کندھا ملا رکھا ہے لیکن باقی ہر میدان میں اور خاص طور پر معیشت میں اس کا بُرا حال ہے۔ تو یہ درحقیقت سرمایہ داری اور اشتراکیت کا منطقی نتیجہ ہے۔ ان دونوں نظاموں کے اس فرق کو سمجھ کر ہمیں اسلام کے معاشی واقتصادی نظام کو سمجھنے کی طرف آگے بڑھنا ہو گا۔

## سرمایہ داری اور اشتراکیت میں مماثلت

ان نظاموں کے حوالے سے ایک بنیادی بات اور سمجھ لیں کہ یہ دونوں نظام اگرچہ اقتصادی طور پر ایک دوسرے کی ضد ہیں' نقیض ہیں' لیکن بعض چیزیں ان میں قدرِ مشترک کے طور پر بھی موجود ہیں۔

**(۱) مادہ پرستی:** ان نظاموں کی نظریاتی اور فکری اساس ایک ہی ہے' یعنی مادہ پرستی اور سیکولرزم۔ یہ مادیت (materialism) ہی تھی جس نے ایک قدم اور آگے بڑھا کر جدلی

مادیت (dialectical materialism) کی شکل اختیار کر لی۔ مادہ پرستی کی اس آخری منطقی انتہا جدلی مادیت میں مذہب' اخلاقیات اور روحانیت کا سرے سے انکارِ محض ہے' جبکہ مادیت بھی بہرحال انسانی زندگی میں یہ دو خانے ضرور بنا دیتی ہے کہ مذہب کو اپنی ذات کی حد تک رکھو' جو چاہو عقیدہ رکھو' جس چیز کو چاہو پوجو۔ سماجی رسومات (social customs) کی حد تک بھی تمہیں تھوڑی بہت آزادی ہے' جبکہ باقی پوری اجتماعی زندگی سے مذہب کا کوئی تعلق نہیں۔ گویا مذہب اگر وہاں ہے بھی تو برائے نام اور ایک علامت (symbol) کی حیثیت سے' اس سے زیادہ نہیں۔ ان دونوں نظاموں میں درحقیقت دین' مذہب' آسمانی ہدایت' اللہ کا یا کسی خالق کائنات کا کوئی تصور' مدبر کائنات کا کوئی تصور' کسی آسمانی ہدایت کا کوئی تصور' سرے سے خارج از بحث ہے۔

(۲) جمہوریت: دوسری چیز جو ان دونوں کے نزدیک متفق علیہ ہے وہ جمہوریت ہے۔ ان میں سے ہر ایک کا دعویٰ ہے کہ ہمارا جمہوری (democratic) نظام ہے' چاہے انہوں نے یک جماعتی نظام کی جمہوریت اختیار کی ہے یا دو جماعتی نظام کی' چاہے وہ جمہوریت صدارتی نظام کی ہو یا وفاقی نظام کی۔ اس ضمن میں یونین آف سوویت سوشلسٹ ری پبلک (USSR) کو بھی حالات کے جبر کے تحت کچھ آگے بڑھنے پر مجبور ہونا پڑ گیا ہے۔

یہ دونوں چیزیں ان میں قدرِ مشترک کے طور پر موجود ہیں' فرق صرف کیفیت کا (qualitative) ہے۔ جمہوریت' انسانی حاکمیت اور انسانی خودمختاری کا تصور ان دونوں کے ہاں ہے' پھر یہ کہ مذہب کی کوئی علامتی حیثیت ہو تو ہو لیکن ان کے ہاں اصل شے مادیت ہے اور ان کے نزدیک کائنات کی اساس مادہ ہے۔ آپ یوں کہہ لیجیے کہ ان دونوں نظاموں کی بنیاد اور اساس ایک ہے اور فرق صرف واجبی سا ہے۔ باقی یہ دونوں "اَلْکُفْرُ مِلَّۃٌ وَّاحِدَۃٌ" کا مصداق ہیں —— کفر کے کتنے بھی رنگ (shades) اور کتنی ہی مختلف صورتیں ہوں وہ درحقیقت ایک ہی شے اور ایک ہی ملت ہے۔ یہاں یہ بات پیش نظر رہے کہ اسلام کا معاملہ ان دونوں سے بنیادی طور پر جدا ہے۔ اسی لیے ہم نے ''اسلام کا نظام حیات'' کے موضوع پر سلسلہ وار خطابات کا آغاز ایک تمہیدی خطاب ''اسلامی نظام کی نظریاتی اساس: ایمان'' سے کیا تھا۔ اب میں چاہتا ہوں کہ اس تمہید کے پس منظر میں سمجھا جائے کہ ''اسلام کا معاشی اور اقتصادی نظام'' ہے کیا!



## اسلام کے دو معاشی نظام

اسلام کے معاشی نظام کے ضمن میں پہلی بات جو میں عرض کر رہا ہوں وہ آپ میں سے اکثر حضرات کے علم میں ہوگی' لیکن شاید یہ اندازِ تعبیر کسی اور نے اختیار نہ کیا ہو۔ میں یہ اندازِ تعبیر' بات کو سمجھانے کے لیے اور چونکانے کے لیے استعمال کر رہا ہوں تاکہ ذہن بیدار ہو جائیں۔ اور واقعہ یہ ہے کہ اس سے بہت بڑی الجھنیں (confusions) حل ہو جاتی ہیں۔ وہ یہ ہے کہ اسلام کا اقتصادی نظام ایک نہیں دو ہیں اور دونوں اپنی اپنی جگہ از ابتدا تا انتہا مکمل ہیں۔ دونوں کا اپنا اپنا فلسفہ ہے' دونوں کا مختلف نظریۂ ملکیت' نظریۂ حقوق اور نظریۂ قدر زائد (surplus value) ہے اور یہ تمام چیزیں کسی بھی معاشی نظام میں بنیادی اہمیت کی حامل ہوا کرتی ہیں۔ چنانچہ اسلام کا ایک اقتصادی تصور ایمان کی بنیاد پر قائم ہوتا ہے اور یہ بات ذہن میں مستحضر رہے کہ یہ ایمانِ حقیقی ہے' نہ کہ ایمان قانونی' جس پر ہم گزشتہ خطابات میں تفصیل سے گفتگو کر آئے ہیں۔ یوں سمجھئے کہ اسلام کا ایک ایمانی' اخلاقی' روحانی یا احسانی نظامِ معیشت ہے اور دوسرا اسلام کا قانونی اور فقہی نظامِ معیشت ہے۔ ان دونوں میں خاصا فرق و تفاوت ہی نہیں بلکہ تضاد بھی موجود ہے۔

بہرحال یہ ایک اندازِ تعبیر ہے۔ یوں بھی کہا جا سکتا ہے کہ یہ دونوں ایک ہی نظام کے دو رُخ یا دو پہلو ہیں' اور یہ دونوں بہت حد تک ایک دوسرے پر منحصر (interdependent) بھی ہیں اور باہم مربوط (interconnected) بھی۔ اور اسلام کی اصل برکات و ثمرات کا کامل ظہور ان دونوں کے اتصال و اجتماع ہی سے ہو سکتا ہے۔ یہاں تک کہ یہ کہنا ہرگز غلط نہ ہوگا کہ اگر ان میں سے ایک پہلو نگاہوں سے اوجھل رہ جائے اور توجہ صرف ایک ہی پر مرتکز ہو جائے تو اس سے جو تصویر سامنے آئے گی وہ بہت بعید از حقیقت ہوگی۔ ان دونوں کے تقاضے بسا اوقات مختلف ہی نہیں متضاد ہوتے ہیں' تاہم ان دونوں کے امتزاج ہی سے اسلام کا کامل نظامِ معیشت وجود میں آتا ہے۔ آپ چاہیں تو ان دونوں پہلوؤں کو ''دعویٰ'' (thesis) اور ''جوابِ دعویٰ'' (anti-thesis) سے تعبیر فرما لیں اور اسلام کے مجموعی اقتصادی نظام کو ان دونوں کا امتزاج (synthesis) قرار دے لیں' بہرحال ان کے وجود سے انکار ممکن نہیں ہے!

**اسلام کی قانونی اور اخلاقی تعلیمات میں فرق:** اسلام کی قانونی اور اخلاقی تعلیمات کے مابین جو فرق و تفاوت بہت سے معاملات میں موجود ہے' اس کے لیے میں ایک سادہ سی مثال

قصاص اور عفو کی پیش کیا کرتا ہوں۔ دونوں اعلیٰ اخلاقی اقدار ہیں۔ فرض کیجیے کسی شخص نے آپ پر ظلم کیا' زیادتی کی اور آپ کو تھپڑ بھی مارا۔ اب اگر آپ مجبور ہیں' بدلہ نہیں لے سکتے تو ظاہر بات ہے کہ ''قہرِ درویش بر جانِ درویش'' کے سوا اور کوئی چارہ نہیں ہے۔ اس صورت میں آپ نے صبر کیا ہے تو اس میں کوئی روحانی ترفع' کوئی اخلاقی بلندی نہیں ہے۔ اور اگر آپ بدلہ لینے پر قادر ہیں لیکن آپ معاف کر دیتے ہیں تو اس معاف کرنے سے آپ کے اندر ایک روحانی ترفع پیدا ہوگا' آپ کو روحانی ترقی نصیب ہوگی۔ یہ اسلام کا اخلاقی اور روحانی نظام ہے جو عفو و درگزر کی تلقین کرتا ہے:

﴿ وَلَمَنْ صَبَرَ وَغَفَرَ اِنَّ ذٰلِكَ لَمِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ ﴾ (الشوریٰ)

''البتہ جو شخص صبر سے کام لے اور درگزر کرے تو بے شک یہ بڑی ہمت کے کاموں میں سے ہے۔''

دوسری جانب اسلام کا قانونی اور فقہی نظام ہے جو بدلے اور قصاص کی حوصلہ افزائی کرتا ہے۔ آپ بدلہ لینا چاہتے ہیں تو بدلہ لیں' تھپڑ کا جواب تھپڑ سے دیں:

﴿ وَكَتَبْنَا عَلَيْهِمْ فِيْهَآ اَنَّ النَّفْسَ بِالنَّفْسِ ۙ وَالْعَيْنَ بِالْعَيْنِ وَالْاَنْفَ بِالْاَنْفِ وَالْاُذُنَ بِالْاُذُنِ وَالسِّنَّ بِالسِّنِّ ۙ وَالْجُرُوْحَ قِصَاصٌ ۭ ﴾ (المائدۃ:۴۵)

''اور ہم نے لکھ دیا تھا ان پر اس (تورات) میں کہ جان کے بدلے جان' آنکھ کے بدلے آنکھ' ناک کے بدلے ناک' کان کے بدلے کان اور دانت کے بدلے دانت اور زخموں کا بدلہ ان کے برابر زخم۔''

قصاص کے بارے میں قرآن مجید میں فرمایا گیا: ﴿وَلَكُمْ فِي الْقِصَاصِ حَيٰوةٌ يّٰٓاُولِي الْاَلْبَابِ﴾ (البقرۃ:۱۷۹) ''اے ہوشمندو! قصاص میں تمہارے لیے زندگی ہے۔''

عفو اور قصاص دونوں ہی اعلیٰ اخلاقی اقدار ہیں۔ عفو میں انفرادی اعتبار سے روحانی ترقی ہے اور قصاص میں اس دنیا کے نظام کی درستگی ہے۔ اگر سبھی عفو کرنے لگ جائیں تو نتیجہ یہ نکلے گا کہ مجرموں' ظالموں اور شریروں کی حوصلہ افزائی ہوگی' وہ اور کھل کھیلیں گے۔ ایک شخص نے آج آپ کو تھپڑ مارا ہے' کل کسی اور کو مارے گا' لیکن اگر اس کو جوابی تھپڑ مل گیا تو اس کے ہوش ٹھکانے آ جائیں گے۔ اسلام کا پورا نظامِ حدود و تعزیرات اسی بنیاد پر ہے کہ جرائم اور مظالم کی حوصلہ افزائی نہیں بلکہ روک تھام کرنی ہے تاکہ مجرموں کے ہوش ٹھکانے آ جائیں۔ اسلام نے



اس قسم کی سزائیں تجویز کی ہیں کہ ایک آدمی کو سزا ملے اور ہزاروں کے اوپر لرزہ طاری ہو جائے' اس لیے کہ اس کے بغیر معاشرہ درست نہیں ہوگا۔ اب عفو روحانی انفرادی ترقی کے اعتبار سے اعلیٰ قدر ہے اور قصاص اس پورے دنیوی انتظامی معاملات کو درست رکھنے کے لیے اعلیٰ قدر ہے۔ بظاہر عفو و قصاص ایک دوسرے کی بالکل ضد ہیں لیکن کون کہہ سکتا ہے کہ انسانی معاشرہ ان دونوں میں سے صرف ایک پر استوار ہو سکتا ہے۔ دونوں اپنے اپنے مقام پر لازم اور ناگزیر ہیں اور حسن معاشرت ان دونوں کے امتزاج سے وجود میں آتا ہے۔

اس پر قیاس کر کے سمجھ لیجیے کہ اسلام کے معاشی نظام کے بھی دو پہلو ہیں' چنانچہ ایک جانب اسلام کا قانونی اور فقہی نظام معیشت ہے جس کے بارے میں یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ یہ ایک نوع کی محدود سرمایہ داری (controlled capitalism) ہے' اس لیے کہ اس میں انفرادی سرمایہ کاری کی اجازت موجود ہے' اگرچہ اسے ''سرمایہ دارانہ نظام'' بننے سے بعض تحدیدی اقدامات نے روک دیا ہے —— دوسری طرف اسلام کا روحانی اور اخلاقی نظام معیشت ہے' جس کے بارے میں میں پورے انشراحِ صدر سے عرض کرتا ہوں کہ وہ نہایت اعلیٰ قسم کی روحانی اشتراکیت (spiritual socialism) ہے اور ایسا کامل سوشلزم ہے کہ اس کے آگے کا تصور بھی ممکن نہیں ہے۔

## اسلام کے روحانی معاشی نظام کے چار اصول

اسلام کے روحانی معاشی نظام کے چار اصول ہیں جنہیں اچھی طرح ذہن میں مستحضر کر لینا چاہیے:

**(i) انسانی ملکیت کی مطلق نفی:** اسلام کے روحانی معاشی نظام کا سب سے پہلا اور اہم اصول یہ ہے کہ انسان کسی شے کا مالک نہیں ہے' حتیٰ کہ وہ خود اپنا اور اپنے وجود کا مالک بھی نہیں ہے۔ اس کے اعضاء' ہاتھ پاؤں' جسم و جان اور اس کی کُل توانائیاں سب اللہ کی ملکیت ہیں اور وہ زیادہ سے زیادہ یہ کہہ سکتا ہے کہ میں ان کا امین ہوں۔ یہ سب کچھ اس کے پاس امانت ہے جبکہ ملکیت تو صرف اللہ کی ہے۔ قرآن پاک میں بار بار یہ الفاظ آئے ہیں: ﴿لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ﴾ اور ﴿لِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ﴾ کہ آسمانوں اور زمین میں جو کچھ ہے اس سب کا مالک صرف اللہ ہے۔

اسلام کے سیاسی نظام پر گفتگو کرتے ہوئے میں نے تفصیل سے بیان کیا تھا کہ حاکمیت

صرف اللہ کے لیے ہے جبکہ انسان کے لیے خلافت ہے۔ اللہ کے علاوہ کسی اور کے لیے حاکمیتِ مطلقہ تسلیم کرنا کفر ہے‘ شرک ہے۔ اللہ کی حاکمیتِ مطلقہ کا منطقی نتیجہ انسان کی خلافت کی صورت میں نکلتا ہے۔ بالکل اسی طرح اسلام کے روحانی معاشی نظام میں بھی ملکیتِ مطلقہ اللہ کی ہے اور انسان کی حیثیت امین کی ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ اسلام کے سیاسی نظام کے حوالے سے یہ تصور تو خاصا عام ہو گیا ہے اور سب کو معلوم ہے کہ اسلام میں حاکمیتِ مطلقہ اللہ کی ہے اور انسان کے لیے خلافت ہے‘ جبکہ اسلام کے معاشی نظام کے حوالے سے یہ پہلو بدقسمتی سے ابھی بہت مخفی ہے کہ حقیقتاً ملکیت اللہ تعالیٰ کی ہے جبکہ انسان کو صرف ملکیتِ مجازی حاصل ہے‘ یعنی انسان کو ان اشیاء میں حق تصرف (صرف استعمال کرنے کا حق) حاصل ہے اور یہ حق تصرف وراثتاً منتقل بھی ہوتا ہے۔ لیکن اللہ کے علاوہ کسی اور کے لیے حقیقتاً ملکیت کا تصور کفر اور شرک ہے۔ مالک صرف اللہ ہے اور انسان زیادہ سے زیادہ یہ کہہ سکتا ہے کہ میں اس مال کا امین ہوں۔ بقول اقبال ؏ ’’بندۂ مؤمن امیں حق مالک است!‘‘ اور بقول شیخ سعدیؒ ؎

ایں امانت چند روزہ نزدِ ماست
درحقیقت مالکِ ہر شے خدا ست

اقبال نے اس کی بہت صحیح تعبیر کی ہے ؎

رزقِ خود را از زمیں بردن رواست
ایں متاعِ بندہ و مِلکِ خدا ست

اسی طرح اقبال کا جو شعر میں نے ابتدا میں آپ کو سنایا تھا ؎

اس سے بڑھ کر اور کیا فکر و عمل کا انقلاب
پادشاہوں کی نہیں‘ اللہ کی ہے یہ زمیں!

یعنی کسی کی ملکیت نہیں‘ نہ تمہاری ملکیت نہ بادشاہ کی ملکیت‘ جیسے نہ تمہاری حاکمیت ہے نہ بادشاہ کی اور نہ فردِ واحد کی —— لہٰذا ملوکیت بھی کفر و شرک ہے اور اجتماعی حاکمیت بھی۔ اسی طرح ملکیت بھی نہ تمہاری ہے نہ قوم کی۔ یعنی قومی ملکیت بھی نہیں ہے‘ ریاست کی ملکیت بھی نہیں ہے‘ ملکیت صرف اور صرف اللہ کی ہے۔

**(۲) انسان کی کمائی کسب نہیں فضلِ خداوندی ہے:** روحانی معاشی نظام کا دوسرا اصول ایک بہت اہم ایمانی حقیقت ہے کہ جو کچھ انسان کو اس دنیا میں ملتا ہے وہ اس کی کمائی‘ اس کا



کسب نہیں‘ بلکہ اللہ کا فضل ہے۔ گو انسان نے اس کے لیے محنت کی ہے‘ ہل چلایا ہے‘ بیج ڈالا ہے‘ کھیتی کو سینچا ہے‘ فصل کو کاٹا ہے‘ غلّہ گھر میں لے کر آیا ہے‘ دُکان میں بیٹھ کر محنت کی ہے‘ کارخانے میں محنت کی ہے‘ الغرض محنت اُس نے کی ہے‘ لیکن ایمان کا تقاضا ہے کہ جو تمہیں ملا ہے اس کو اپنا کسب نہیں بلکہ اللہ کا فضل سمجھو۔ رزق کے لیے قرآن مجید کی اصل اصطلاح ’’فضل‘‘ ہے۔ صرف ایک جگہ رزق کے لیے یعنی دُنیاوی معاشی جدّوجُہد اور کوشش کے لیے کسب کا لفظ آیا ہے‘ ورنہ قرآن میں کسب صرف اعمالِ حسنہ یا اعمالِ سیّئہ کے لیے آتا ہے۔ اسلام کے عائلی اور معاشرتی نظام کے ضمن میں ایک آیت آئی تھی: ﴿لِلرِّجَالِ نَصِيبٌ مِّمَّا اكْتَسَبُوا ۖ وَلِلنِّسَاءِ نَصِيبٌ مِّمَّا اكْتَسَبْنَ ۚ﴾ (النساء:۳۲) یہاں کسب سے مراد معاشی کسب نہیں بلکہ نیکی کا کسب ہے۔ اسی طرح: ﴿لَهَا مَا كَسَبَتْ وَعَلَيْهَا مَا اكْتَسَبَتْ ۗ﴾ (البقرۃ:۲۸۶) میں بھی اعمالِ حسنہ اور اعمالِ سیّئہ کے لیے کسب کا لفظ استعمال ہوا ہے۔

معاشی جدّوجُہد کے لیے قرآنی اصطلاح کسب نہیں فضل ہے اور فضل اسے کہتے ہیں جو بلا استحقاق ملے۔ لہٰذا اللہ نے جو کچھ تمہیں دیا ہے‘ یہ اللہ کا فضل ہے۔ اس کے لیے سب سے آسان اور لوگوں کے ذہنوں میں پہلے سے موجود یہ آیت حوالے کے لیے کافی ہے: ﴿فَإِذَا قُضِيَتِ الصَّلَاةُ فَانتَشِرُوا فِي الْأَرْضِ وَابْتَغُوا مِن فَضْلِ اللَّهِ﴾ (الجمعہ:۱۰) ’’پھر جب تم فارغ ہو جاؤ نماز سے (یعنی نماز ادا کر چکو) تو زمین میں پھیل جاؤ اور اللہ کے فضل کو تلاش کرو‘‘۔ اگر انسان اپنی کمائی کو اپنی محنت کا ثمرہ سمجھے گا تو اس پر اپنا حق ملکیت جتائے گا‘ لیکن اگر اسے اللہ کا فضل سمجھے گا تو اس میں تصرف بھی اصل مالک اور عطا کنندہ کی مرضی کے مطابق کرے گا۔

**(۳) فضل خداوندی میں انسان کا جائز حق بقدر ضرورت ہے:** تیسرا اصول یہ ہے کہ اس فضل خداوندی میں انسان کا جائز حق صرف اس کی ضروریات کے بقدر ہے‘ اور ان بنیادی انسانی ضرورتوں کو بھی بعض احادیث میں معیّن کر دیا گیا ہے۔ یعنی (ا) انسان کو اگر دو وقت کا کھانا مل گیا ہے۔ (ب) پہننے کے لیے اگر دو جوڑے کپڑوں کے موجود ہیں۔ (ج) سر چھپانے کے لیے اگر ایک چھت موجود ہے۔ (د) اور اپنے کردار‘ اخلاق اور عفت کی حفاظت کے لیے اگر بیوی بھی موجود ہے (اور بیوی کے لیے شوہر موجود ہے) تو انسان کو اس کا بنیادی حق مل گیا۔ یہ انسان کی کل ضروریاتِ زندگی ہیں جو اس کو اس دنیا کے اندر درکار ہیں۔ مرزا عبدالقادر بیدل کا بڑا پیارا شعر ہے‘ جو اورنگ زیب عالمگیر کو بہت پسند تھا اور وہ ہر وقت پڑھتے رہتے تھے ؎

حرص قانع نیست بیدل ورنہ در کارِ حیات
آنچہ ما در کار داریم اکثرش درکار نیست!

یعنی یہ تو ہماری حرص ہے جو ہمیں قناعت نہیں کرنے دیتی' ورنہ واقعہ یہ ہے کہ ہم نے جن چیزوں کو اپنے لیے دنیا کی زندگی میں لوازمات اور ضروریات کی فہرست میں شمار کر لیا ہے' ان میں سے اکثر ضروریاتِ زندگی نہیں ہیں۔ بہرحال تیسرا اصول یہ ہے کہ انسان کا اصل حق صرف اس کی ضروریات کی حد تک ہے۔

(۴) ضروریات سے زائد دوسروں کا حق ہے: انسانی ضرورت سے جو کچھ زائد ہے اس کے بارے میں اخلاقی اور روحانی سطح پر اسلام کی تعلیم یہ ہے کہ وہ خواہ قانونی اعتبار سے تمہارا ہے' لیکن حقیقت کے اعتبار سے تمہارا نہیں دوسروں کا حق ہے' جو تمہارے مال میں رکھ کر تمہیں آزمایا جا رہا ہے۔ یہ تمہارے پاس امانت ہے اور اس میں تمہارا امتحان ہے کہ تم یہ امانت دوسروں تک پہنچا کر سبکدوش ہوتے ہو یا اس پر قبضۂ غاصبانہ جما کر بیٹھے رہتے ہو اور ''مَالِیْ مَالِیْ'' (میرا مال' میرا مال) کی رٹ لگائے رکھتے ہو۔ یہ حدیث کے الفاظ ہیں۔ پوری حدیث اس طرح ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا:

((یَقُوْلُ الْعَبْدُ :مَالِیْ مَالِیْ وَاِنَّ مَالَهٗ مِنْ مَالِهٖ ثَلَاثٌ :مَا اَکَلَ فَاَفْنٰی اَوْ لَبِسَ فَاَبْلٰی اَوْ اَعْطٰی فَاَقْتَنٰی' وَمَا سِوٰی ذٰلِكَ فَهُوَ ذَاهِبٌ وَتَارِكُهٗ لِلنَّاسِ))(۱)

''بندہ کہتا رہتا ہے کہ میرا مال' میرا مال اور حقیقت یہ ہے کہ اس کو اس مال و دولت میں سے جو کچھ حاصل ہوتا ہے وہ فی الجملہ تین چیزیں ہیں: ایک وہ چیز جس کو اس نے کھا کر ختم کر دیا' دوسری وہ چیز جس کو اس نے پہن کر بوسیدہ کر دیا اور تیسری وہ چیز جس کو اس نے (خدا کی راہ میں) دیا اور (آخرت کے لیے) ذخیرہ کر لیا۔ ان تینوں کے سوا جو کچھ ہے وہ سب ایسا ہے جس کو وہ لوگوں کے لیے چھوڑ کر (اس دُنیا سے) چلا جانے والا ہے۔''

قرآن حکیم نے بھی واضح الفاظ میں فرمایا کہ یہ جو عفو (زائد مال) تمہارے ساتھ چمٹا ہے یہی نجاست ہے' یہی روح کے لیے سب سے بڑی گندگی ہے' اور یہی تمہارے روحانی ارتقاء کے لیے سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔ اسے خرچ کر کے اپنے آپ سے دور کر دو۔ جب حضور ﷺ سے پوچھا گیا کہ آخر کہاں تک خرچ کریں' اس کی حد کیا ہے؟ تو اس پر یہ آیت نازل ہوئی: ﴿وَيَسْـَٔلُوْنَكَ مَا ذَا يُنْفِقُوْنَ ۭ قُلِ الْعَفْوَ ۭ﴾(البقرۃ:۲۱۸) ''اور یہ آپؐ سے

(۱) صحیح مسلم' کتاب الزھد والرقائق۔ عن ابی ھریرۃؓ۔



پوچھتے ہیں کہ (اللہ کی راہ میں) کتنا خرچ کریں۔ کہہ دیجیے' جو بھی ضرورت سے زائد ہو'۔ یعنی جو بھی ضرورت سے زائد ہے اسے دے ڈالو اور کوئی شے بھی اپنے پاس ضرورت سے زیادہ نہ رکھو۔

اسلام کے اخلاقی اور روحانی نظامِ معیشت کے مذکورہ بالا چار بنیادی اصول اچھی طرح ذہن نشین کر لیجیے۔

## اسلام کا روحانی و اخلاقی نظامِ معیشت: ایک مکمل معاشی نظام

اسلام کا روحانی و اخلاقی نظامِ معیشت ایک مکمل معاشی نظام ہے۔ اس میں ملکیت اور قدرِ زائد کا اپنا جداگانہ تصور ہے اور اس قدرِ زائد کا مصرف بھی طے شدہ ہے۔ سب جانتے ہیں کہ نبی اکرم ﷺ نے خود اسی اخلاقی نظام کے مطابق زندگی بسر کی ہے۔ چنانچہ یہ بات بہت سے لوگوں کے لیے حیران کن ہو گی کہ نبی اکرم ﷺ نے تمام عمر ''زکوٰۃ'' ادا نہیں کی۔ اس لیے کہ زکوٰۃ تو صاحب نصاب پر عائد ہوتی ہے جبکہ آپؐ نے کبھی کوئی درہم و دینار اپنے پاس رکھا ہی نہیں کہ زکوٰۃ کی نوبت آتی۔

میں نے ایک صاحب کو ذرا روکھے (crude) انداز میں سمجھایا تھا کہ ایک ہے زکوٰتی دین' کہ آپ حلال ذریعے سے کمائیں' پھر جو جمع ہو گیا اس میں سے صرف زکوٰۃ دے دیں' باقی جو بچ جائے وہ آپ کا ہے' آپ اس کو کھائیں' پئیں' عیش کریں' جمع کریں ـــــ لیکن یہ بات یاد رکھیے کہ اس زکوٰتی دین پر محمدؐ رسول اللہ ﷺ نے عمل نہیں کیا۔ وہ چونک گئے اور میرا یہ انداز بھی چونکانے کے لیے تھا تاکہ بات سمجھ آ جائے۔ جیسے حضور ﷺ پوچھا کرتے تھے: ((اَتَدْرُوْنَ مَنِ الْمُفْلِسُ؟)) ''تم جانتے ہو کہ مفلس کون ہوتا ہے؟'' حالانکہ ہر شخص جانتا ہے کہ مفلس کسے کہتے ہیں' لیکن یہ انداز چونکانے کے لیے ہے تاکہ لوگ غور کریں اور پھر سمجھیں۔ میں نے بھی اس شخص سے کہا کہ محمدؐ رسول اللہ ﷺ نے اس زکوٰتی دین پر عمل نہیں کیا' اس لیے کہ زکوٰۃ تو تب واجب الادا ہو گی جب کچھ مال جمع ہو گا' جب مال ہی جمع نہیں ہو گا تو زکوٰۃ کہاں فرض ہو گی؟ گویا محمدؐ رسول اللہ ﷺ نے ساری عمر زکوٰۃ ادا نہیں کی' اسلام کے ایک رکن پر عمل نہیں ہوا' لیکن دوسری طرف ہر دم زکوٰۃ ادا کی ہے۔ وہ زکوٰۃ اور ہے ـــ میں نے ابتدا میں سورۃ المؤمنون کی ایک آیت تلاوت کی: ﴿وَالَّذِيْنَ هُمْ لِلزَّكٰوةِ فٰعِلُوْنَ ۝﴾(المؤمنون) ''وہ جو زکوٰۃ پر مستقل کاربند رہتے ہیں''۔ رسول اللہ ﷺ اس زکوٰۃ کو ہر دم ادا کرتے تھے اور ضرورت سے زائد مال کبھی اپنے پاس نہ رکھتے تھے۔ آپؐ اس نجاست کو لگنے ہی نہیں دیتے تھے۔ آپ نے

وہ واقعہ سنا ہوگا کہ ایک روز نبی اکرم ﷺ فجر کی نماز کے بعد بے چین ہوکر اچانک صفوں کو پھلانگتے ہوئے اپنے حجرے میں تشریف لے گئے۔ لوگ حیران ہوئے کیونکہ یہ بڑی غیر معمولی بات تھی۔ جب آپؐ واپس آئے تو فرمایا: مجھے اچانک یاد آیا تھا کہ رات کے وقت کہیں سے سونے کی ایک ڈلی آئی تھی' رات گزر گئی اور میں نے وہ تقسیم نہیں کی' بھول گیا۔ اب مجھے خیال آیا تو میں نے فوری طور پر جا کر اسے تقسیم کر دیا۔ نبی مکرم ﷺ اپنے رب سے اس کیفیت میں نہیں ملنا چاہتے تھے کہ انہیں اپنے ربّ پر اعتماد نہ ہو۔ مال و دولت اپنے پاس جمع رکھنا اپنے ربّ سے بے اعتمادی ہے۔

یہ اسلام کا روحانی اور اخلاقی نظام معیشت ہے اور اسی پر فقراء صحابہ رضی اللہ عنہم کاربند تھے۔ ''فقراء صحابہ'' ایک خاص اصطلاح ہے' یعنی وہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم جنہوں نے ''اختیاری فقر'' کے نظام کو عملاً اختیار کیا' جن کے سرخیل حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ تھے۔ بقیہ تمام صحابہؓ (جن کے پاس سرمایہ جمع بھی ہوتا) جو اس فہرست میں نہیں آتے وہ بھی بِالقُوّہ اسی اصول پر عمل پیرا تھے کہ جب مطالبہ آئے گا سارا مال پیش کر دیں گے۔ جیسے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے غزوۂ تبوک کے موقع پر اپنا سب کچھ لا کر دے دیا' حالانکہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کا شمار فقراء صحابہ میں تو نہیں ہے' لیکن آمادگی ہر وقت تھی کہ یہ امانت ہے جب بھی وقت آئے گا' حاضر کر دیں گے۔ انہوں نے اس مال و دولت کو اپنے دل کے ساتھ چپکایا نہیں تھا۔ چنانچہ محمدؐ رسول اللہ ﷺ اور فقراء صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا بالفعل جبکہ بقیہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا بِالقُوّہ جو دین تھا وہ درحقیقت ''زکوٰتی دین'' نہیں تھا۔

## اسلام کا روحانی نظام معیشت' اعلیٰ قسم کی روحانی اشتراکیت

اسلام کے روحانی اور اخلاقی نظامِ معیشت کے ان اصولوں کو جمع کر کے میں پورے انشراحِ صدر سے کہوں گا کہ اسلام کا اخلاقی نظام معیشت نہایت اعلیٰ اور خالص ترین روحانی اشتراکیت (Highest and purest form of spiritual socialism) ہے۔ یہ ایک ایسا کامل سوشلزم ہے کہ اس سے بلند تر سوشلزم کا تصور ممکن ہی نہیں۔ اس لیے کہ سوشلزم میں تو انسانی ملکیت کا اثبات موجود ہے' اگرچہ انفرادی نہیں بلکہ اجتماعی' لیکن اسلام اپنی اخلاقی و روحانی اور صحیح تر الفاظ میں ایمانی تعلیم کی رو سے انسانی ملکیت کی کلی نفی کرتا ہے — یعنی نہ انفرادی ملکیت نہ قومی ملکیت' بس ہر چیز اللہ کی ملکیت —— معلوم ہوا کہ یہ اعلیٰ قسم کی روحانی



اشتراکیت ہے۔ یہ روحانی (spiritual) اس لیے ہے کہ اس میں جبر نہیں ہے' یعنی اس اخلاقی نظام کی ساری خوبی اور اس کا کل حسن اس کے ''رضا کارانہ'' (voluntary) ہونے میں مضمر ہے۔ اور اگر ''قُلِ الْعَفْوَ'' کے فلسفے کو ادنیٰ درجہ میں بھی بالجبر نافذ کرنے کی کوشش کی گئی تو روح والی بات ختم ہو جائے گی۔ یہ صرف اور صرف انسان کے اپنے اختیار اور اپنی مرضی پر منحصر ہے۔ جیسے جیسے ایمان میں ترقی ہو' جیسے جیسے یقین بڑھے' جیسے جیسے اللہ سے محبت میں اضافہ ہو' جیسے جیسے آخرت ہی انسان کا مطلوب بنتی چلی جائے اور ''اَللّٰھُمَّ لَا عَیْشَ اِلَّا عَیْشَ الْاٰخِرَۃ'' پر یقین بڑھتا جائے اور اس حقیقت کا شعور انسان کے قلب و ذہن میں راسخ ہوتا جائے' اتنا ہی وہ اس کے اوپر عمل پیرا ہو جائے۔ اس کے لیے آپ کو کوئی قانون مجبور نہیں کرے گا' کوئی خارجی دباؤ اثر انداز نہیں ہوگا۔ اگر کہیں بھی کسی بھی درجے میں خارجی جبر آ گیا تو اس کی ساری خوبصورتی ختم ہوگئی۔ یہ وہ آبگینہ ہے جو ذرا سی ٹھیس لگنے سے چکنا چور ہو جائے گا۔

## اسلام کا قانونی اور فقہی نظامِ معیشت

اس کے بالکل برعکس اسلام کا ایک قانونی اور فقہی نظام معیشت ہے۔ اس میں مجازاً انسانی ملکیت کا اثبات ہے۔ یہ گھر آپ کا ہے' یہ سامان آپ کا ہے' یہ کھیت آپ کا ہے' یہ زمین آپ کی ہے' یہ دکان آپ کی ہے' یہ مال آپ کا ہے یعنی ملکیت تو ہے لیکن مجازاً — اس معنی میں کہ آپ اس کو خود استعمال کریں گے' دوسرا استعمال نہیں کر سکے گا۔ جب دوسرے کو اس کے استعمال سے روک دیا گیا تو یہ ایک طرح کی ملکیت بن گئی۔ مزید برآں یہ وراثتاً بھی منتقل ہو جائے گا' چنانچہ بات ملکیت کے بہت حد تک قریب آ گئی' لیکن ذہن میں ہمیشہ یہ رہنا چاہیے کہ میں اس کا مالک نہیں' امین ہوں۔ اسلام میں قانونی سطح پر ملکیت کا اثبات موجود ہے اور نبی اکرم ﷺ نے جو نظام برپا کیا تھا اس میں کہیں جبر نہیں ہے بلکہ اس کے برعکس آزاد معیشت کے مواقع دیے گئے کہ تم حلال و حرام کی حدود کا خیال رکھتے ہوئے اپنی محنت سے جو کماؤ گے وہ تمہارا ہوگا' اس میں تمہارا حق تصرف تسلیم کیا جائے گا اور اسے وراثتاً منتقل بھی کیا جائے گا۔ اس طرح اس میں سرمایہ دارانہ نظام کے تینوں بنیادی اصول (cardinal principles) آ گئے:

(1) private ownership (نجی ملکیت)
(ii) personal incentive (ذاتی مفاد)
(iii) free enterprise (آزاد معاشی جدّوجُہد)

اسلام کے فقہی نظام میں یہ تینوں چیزیں بتمام وکمال موجود ہیں جن کی بنیاد پر آج مغربیت فتح مند ہے۔ البتہ اسلام نے اس قانونی نظام کو بھی ایک حد کے اندر رکھا ہے تاکہ یہ سرمایہ داری کی لعنت کی صورت اختیار کر کے انسانی معاشرے پر مسلّط نہ ہونے پائے۔

اس ضمن میں اسلام نے چند عملی تدابیر اختیار کی ہیں اور کچھ قدغنیں بھی لگائی ہیں۔ اوّلین قدغن تو یہ ہے کہ حرام ذرائع سے نہیں کماؤ گے' حلال سے کماؤ گے۔ دوسرے یہ کہ اگر کچھ مال تمہارے پاس جمع ہو گیا تو اس میں سے ایک حد کے بعد کچھ معین حصہ لیا جائے گا اور ان کو دیا جائے گا جو لوگ معاشی میدان میں پیچھے رہ گئے ہیں۔ یہاں یہ بات نوٹ کر لیں کہ آزاد معاشی جدوجہد کا معاملہ جہاں بھی ہوگا' چاہے کتنی ہی تھوڑی آزادی ہو' اس میں یقیناً کچھ لوگ آگے نکلیں گے اور کچھ لوگ پیچھے رہ جائیں گے' کچھ اونچ نیچ لازماً پیدا ہو گی۔ میں اس کی مثال دیا کرتا ہوں کہ اگر آپ نے لوگوں کو دوڑانا بھی ہے اور یہ بھی چاہتے ہیں کہ نہ کوئی آگے نکلے اور نہ کوئی پیچھے رہ جائے تو اس کے لیے آپ سب کو ایک رسی سے باندھ دیجیے۔ اگر آپ رسی نہیں باندھیں گے تو پھر کوئی نہ کوئی آگے جائے گا اور کوئی نہ کوئی پیچھے رہ جائے گا۔ جہاں کسی نہ کسی درجے میں آزادی ہو گی وہاں معاشی جدّوجُہد کی دوڑ میں فرق وتفاوت سے بچنا ممکن نہیں۔ اس دوڑ میں لوگوں کے درمیان فرق بہرصورت آئے گا اور کچھ لوگ آگے نکل جائیں' کچھ لوگ پیچھے رہ جائیں گے۔ اسلام کے قانونی اور فقہی نظامِ معیشت میں اس بات کا بھی اہتمام کیا گیا ہے کہ معاشرے میں پیدا ہونے والے مالی فرق وتفاوت کو کسی حد تک کم کیا جائے۔ اس کے لیے اسلام نے زکوٰۃ کا نظام قائم کیا ہے۔ اسلام کا قانونی اور فقہی نظامِ معیشت ایک نوع کی محدود اور منضبط سرمایہ داری (managed and controlled capitalism) ہے' جیسے میں نے اس روحانی نظام کے بارے میں کہا تھا کہ وہ نہایت اعلیٰ اور خالص ترین روحانی اشتراکیت ہے۔

## اسلام کے روحانی اور قانونی نظامِ معیشت میں ظاہری تفاوت

اسلام کے نظامِ معیشت میں ایک طرف روحانی اعتبار سے اشتراکیت موجود ہے اور دوسری طرف قانونی اعتبار سے سرمایہ داری۔ اس اعتبار سے ہمارے ہاں بڑا کنفیوژن پایا جاتا ہے کہ یہ دونوں تعلیمات اسلام میں بیک وقت موجود ہیں۔ ایک طرف ''قُلِ الْعَفْوَ'' کا فلسفہ ہے کہ جتنا ضرورت سے زائد ہے اسے اللہ کی راہ میں دے ڈالو اور دوسری طرف قانونِ وراثت بھی اسی قرآن میں موجود ہے۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر کچھ رکھنا ہی نہیں ہے تو وراثت



کس شے کی ہو گی؟ تو یہ ایک طرح کا ظاہری تضاد (contradiction) ہے —— ایک طرف سورۃ التوبہ کی آیت ہے:

﴿وَالَّذِيْنَ يَكْنِزُوْنَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ وَلَا يُنْفِقُوْنَهَا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۙ فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ ۝ يَّوْمَ يُحْمٰى عَلَيْهَا فِيْ نَارِ جَهَنَّمَ فَتُكْوٰى بِهَا جِبَاهُهُمْ وَجُنُوْبُهُمْ وَظُهُوْرُهُمْ ۭ هٰذَا مَا كَنَزْتُمْ لِاَنْفُسِكُمْ فَذُوْقُوْا مَا كُنْتُمْ تَكْنِزُوْنَ ۝﴾

''جو لوگ سونا اور چاندی جمع کرتے ہیں اور انہیں اللہ کی راہ میں خرچ نہیں کرتے تو انہیں دردناک عذاب کی بشارت دے دیجیے۔ اس دن ان کے کنز کو جہنم کی آگ میں تپایا جائے گا' پھر اس سے ان کی پیشانیاں' ان کے پہلو اور ان کی پیٹھیں داغی جائیں گی (اور کہا جائے گا) یہ ہے جو تم نے اپنے لیے جمع کیا تھا' تو جو کچھ تم جمع کرتے رہے (آج) اس کا مزا چکھو۔''

اب سونا تو سونا ہے چاہے کسی نے ایک تولہ ہی گھر کے اندر رکھا ہوا ہے۔ جبکہ دوسری طرف نصابِ زکوٰۃ معیّن کیا گیا ہے کہ ساڑھے سات تولے سونے کی زکوٰۃ کی فرضیت کا حکم ہے اور سورۃ النساء کا ایک پورا رکوع قانونِ وراثت سے متعلق ہے۔ اس اعتبار سے اسلامی تعلیمات میں بظاہر تضاد معلوم ہوتا ہے۔ اس ظاہری تضاد کی بنیاد پر سوشلسٹ ذہن رکھنے والے حضرات اسلام کے نظامِ معیشت کو کامل سوشلزم سے تعبیر کرتے ہیں اور اس کے دوسرے پہلو کو بالکل نظر انداز کر دیتے ہیں۔ اسی طرح بعض لوگ اسے کامل سرمایہ دارانہ نظام قرار دیتے ہیں اور اس میں موجود روحانی اشتراکیت کی سرے سے نفی کر دیتے ہیں۔

اس ظاہری تضاد کی بنا پر پورے خلوص کے ساتھ محض غلط فہمی کی بنیاد پر بھی مغالطہ لاحق ہو سکتا ہے' جس کی سب سے بڑی مثال حضرت ابوذر غفاری ؓ کی ہے۔ اتنے متقی' اتنے مخلص اور اتنے زاہد انسان کہ حضور ﷺ نے ان کے بارے میں فرمایا:

((مَنْ كَانَ يَسُرُّهٗ اَنْ يَّنْظُرَ اِلٰى زُهْدِ عِيْسٰى فَلْيَنْظُرْ اِلٰى صَاحِبِيْ اَبِيْ ذَرٍّ))

''تم میں سے جو چاہے کہ حضرت عیسیٰؑ کا زُہد اپنی آنکھوں سے دیکھے تو اسے چاہیے کہ میرے ساتھی ابوذر کو دیکھ لے۔''

ان کو بھی اس ظاہری تضاد کی بنا پر ایک مغالطہ ہو گیا۔ ان کے مزاج میں غلبۂ زُہد وورع' دُنیا سے

کنارہ کشی اور لذّاتِ دُنیاوی سے بالکل لاتعلقی اس شدت کے ساتھ تھی کہ انہوں نے آیتِ کنز کو بالکل اس کے ظاہری الفاظ پر محمول کرتے ہوئے یہ رائے قائم کر لی کہ سرے سے اپنے پاس پیسہ رکھنا حرام ہے اور کسی بھی مقدار میں سونا چاندی اپنے پاس رکھنے کی قطعاً اجازت نہیں ہے' اس لیے کہ اس پر عذابِ الیم کی وعید ہے۔ یہ معاملہ اتنا بلند ہوا کہ ایک شورش کی شکل بن گئی' ایک ہنگامہ سا برپا ہو گیا۔ دُنیا کا نظام چونکہ قانون پر چلتا ہے نہ کہ روحانیت پر' لہٰذا خلافتِ راشدہ کا جو اجتماعی فیصلہ تھا وہ بالکل صحیح تھا کہ اس آیت کا یہ مفہوم نہیں ہے' یہ آپ غلط تعبیر کر رہے ہیں' لیکن وہ اپنی رائے پر بضد رہے تو ان کی رائے کو انتہا پسندانہ موقف قرار دیا گیا اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے دورِ خلافت میں انہیں مدینہ سے باہر چلے جانے کی ہدایت بھی کی گئی یا وہ خود چلے گئے۔ لہٰذا انہوں نے ایک بیابان میں جھونپڑی ڈالی اور وہیں ان کا انتقال ہوا۔

آیات کی غلط تعبیر کی ایک اور مثال ملاحظہ کیجیے۔ یہ معاملہ بھی عین دورِ صحابہ میں شروع ہو چکا تھا۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے ایک خطبہ دیا: لوگو میں دیکھ رہا ہوں کہ تم ایک آیت پڑھتے ہو اور اس کے غلط معانی نکال رہے ہو۔ سورۃ المائدۃ کی آیت مبارکہ: ﴿یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا عَلَیْكُمْ اَنْفُسَكُمْ ۚ لَا یَضُرُّكُمْ مَنْ ضَلَّ اِذَا اهْتَدَیْتُمْ ؕ﴾ (آیت ۱۰۵) ''اے ایمان والو! تم پر صرف اپنی ہی ذمہ داری ہے' جو کوئی گمراہ ہو جائے وہ تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتا اگر تم ہدایت پر ہو''۔ تم اس کے یہ معانی نکال رہے ہو کہ دعوت و تبلیغ اور امر بالمعروف و نہی عن المنکر کی ذمہ داری تم پر نہیں ہے۔ اس آیت کا یہ مفہوم نہیں ہے' یہ غلط تعبیر ہے۔ اسی طرح آیت کنز کے معاملہ میں حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ کو مغالطہ ہوا اور اسلام کے روحانی اور قانونی نظام کے اندر جو فرق و تمیز کرنی چاہیے تھی' وہ اپنی ایک خاص زاہدانہ کیفیت میں اس تمیز کو برقرار نہ رکھ سکے۔ کوئی شخص یہ نہیں کہہ سکتا کہ انہوں نے کسی بدنیتی سے یہ رائے قائم کر لی تھی۔ اس لیے میں کہہ رہا ہوں کہ اس معاملے میں مغالطہ خالص نیک نیتی کے ساتھ بھی ہو سکتا ہے۔ اگر ابوذر رضی اللہ عنہ کو ہو گیا تو تا بہ دیگراں چہ رسد!

حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ کے معاملے کو اس دَور میں کچھ لوگوں نے کمیونزم اور سوشلزم کی دلیل بنانے کے لیے بڑی بدنیتی کے ساتھ بھی استعمال کیا ہے۔ انہیں قرآن کی یہ آیتیں تو نظر آ گئیں کہ اسلام انسانی ملکیت کی کُلّی نفی کرتا ہے اور قُلِ الْعَفْوَ کے الفاظ میں ضرورت سے زائد کو اپنے پاس رکھنے سے منع کرتا ہے' لیکن دوسری طرف انہیں آیتِ میراث نظر نہیں آتی؟ زکوٰۃ کا نظام



نظر نہیں آتا؟ اگر کسی کے پاس کوئی شے ہے ہی نہیں تو زکوٰۃ کا پورا نظام کیا ہے؟ چلیے مان لیتے ہیں کہ زکوٰۃ قرآن مجید میں نصاب اور مقداروں کے ساتھ نہیں ہے اور جہاں زکوٰۃ کا لفظ ہے وہاں زکوٰۃ کے معنی وہی لیے جا سکتے ہیں جو میں نے پہلے بیان کیے ہیں کہ مسلسل نجاست کو دھوتے رہنا اور اس کا کوئی ذرّہ اپنے قریب آنے نہ دینا' لیکن احادیثِ نبوی میں کیا کریں گے؟ احادیث میں تو پورا نظام ہے مقادیرِ زکوٰۃ کا۔ معلوم ہوا کہ یہ مغالطہ نیک نیتی سے بھی ہو سکتا ہے اور بدنیتی سے بھی' اور یہ اس دور میں ہو رہا ہے۔

## اخلاقی اور قانونی نظامِ معیشت لازم و ملزوم

ایک اور بات اچھی طرح سمجھ لیجیے کہ اسلامی معاشرے میں اگر صرف اسلام کا قانونی معاشی نظام بتمام و کمال قائم بھی ہو جائے تو اس سے مطلوبہ مقاصد اُس وقت تک حاصل نہیں ہوں گے جب تک کچھ نہ کچھ لوگ' خواہ بہت ہی قلیل تعداد میں ہوں' ایسے نہ ہوں جو اس روحانی معیار پر زندگی بسر کر رہے ہوں۔ اس لیے کہ وہ pace-makers بنتے ہیں' دوسروں کے لیے معیار اور نمونہ بنتے ہیں' وہ اقدار کو معیّن کرتے ہیں' عوام ان کو دیکھتے ہیں کہ ایسے بھی لوگ ہو سکتے ہیں اور ہیں! اس سے معاشرے کی اخلاقی روایات بنتی ہیں کہ اصل عزت نیکی' تقویٰ اور خدا ترسی کی ہے' دولت کی نہیں ہے ☆۔ ورنہ رفتہ رفتہ وہ صورت ہو جاتی ہے جو آج ہمارے معاشرے میں ہے کہ لوگ دولت کی بنیاد پر عزت کے مستحق سمجھے جاتے ہیں اگرچہ معلوم بھی ہے کہ یہ بالکل حرام ذرائع سے کمائی گئی ہے۔ کچھ عرصہ پہلے تک دولت کے ساتھ عزت تو تھی' لیکن حرام ذریعے سے کمائی گئی دولت کے ساتھ عزت نہیں تھی' جبکہ موجودہ دور میں ہم بہت ہی پستی کی طرف پہنچ گئے۔ ہمارے معاشرے میں عزت و احترام کی بنیاد صرف دولت و ثروت اور حکومت و اقتدار بن کر رہ گئے ہیں' حالانکہ لوگوں کو خوب معلوم ہوتا ہے کہ یہ دولت حرام اور ناجائز ذرائع سے کمائی گئی ہے اور یہ اقتدار بھی دھن' دھونس اور دھاندلی کے ذریعے سے حاصل

☆ حقیقی معنی میں تعظیم و تکریم ان ہی فقراء کی ہوتی ہے نہ کہ صاحبانِ تخت و تاج اور اصحابِ دولت و ثروت کی' بلکہ بسا اوقات بڑے بڑے بادشاہ ان بوریا نشین اور خرقہ پوش فقیروں کے در پر حاضری کو اپنے لیے باعثِ سعادت سمجھتے ہیں۔ علامہ اقبال نے کہا ہے:

یقیں پیدا کر اے ناداں' یقیں سے ہاتھ آتی ہے
وہ درویشی کہ جس کے سامنے جھکتی ہے فغفوری (مرتب)

کیا گیا ہے۔ اگر معاشرے میں pace-makers موجود ہوں تو وہ معاشرے کے اندر ایک معیار قائم کر کے لوگوں کے لیے ایک مثال بنیں گے اور وہ درحقیقت اسلام کی اس اعلیٰ روحانی تعلیم کا بھی ایک نمونہ اور مظہر لوگوں کے سامنے پیش کریں گے۔ تب اس قانونی نظام کی برکات صحیح طور پر ظاہر ہو سکیں گی۔

اس کی ایک مثال ملاحظہ کیجیے' جو کوئی بہت زیادہ پرانی نہیں ہے' ابھی تقریباً دو سو سال بھی نہیں ہوئے۔ امیر خان والی ٹونک نے چند گاؤں کا ایک وثیقہ اور دستاویز بنا کر پانی پت کے ایک درویش سلسلہ مجددیہ نقشبندیہ کے بزرگ حضرت بوعلی شاہ قلندرؒ کو بھیجی کہ یہ چند گاؤں آپ کی خانقاہ کے نام لگاتا ہوں' ان کی آمدنی آپ کی خانقاہ میں آتی رہے گی اور آپ کے ہاں جو مسترشدین ہیں اور جو رشد و ہدایت کا سلسلہ ہے' اس کی مالی کفالت ہوتی رہے گی۔ انہوں نے اسی دستاویز کی پشت پر ایک شعر لکھ کر اسے واپس بھجوا دیا ؎

ما آبروئے فقر و قناعت نہ باختیم
با میر خان بگوئے کہ روزی مقدر است!

''ہم یہ جاگیر قبول کر کے اپنے فقر اور درویشی کی عزت و آبرو کا سودا کرنے کو تیار نہیں ہیں۔ امیر خان سے کہہ دو کہ ہماری روزی ہمارے پروردگار کی جانب سے مقرر ہے۔''

یہ اسی طرح کا واقعہ ہے جیسے حج کے موقع پر ایک صاحب علم و فضل کے اردگرد لوگوں کا رجوع عام اور خلقت کا اژدہام دیکھ کر ملکہ زبیدہ نے ہارون الرشید سے کہا تھا: ''اصل حکومت تو ان کی ہے نہ کہ تمہاری''۔ یعنی اصل بادشاہ تو یہ درویش ہے جس کے گرد لوگ عقیدت کے ساتھ جمع ہیں جبکہ تمہارے ساتھ تو یہ تنخواہ یافتہ پہرے دار ہیں۔ معاشرے کے اندر روحانی نظامِ معیشت پر عمل پیرا فقراء اور درویش ضرور موجود ہونے چاہئیں خواہ وہ لاکھوں کروڑوں میں ایک دو آدمی ہوں' اس لیے کہ وہ اس معاشرے کے اندر رجحان اور اقدار کا تعین کرتے ہیں۔

## سرمایہ داری اور اسلامی نظام میں مالی فرق وتفاوت کو کم کرنے کا طریقۂ کار

میں نے اسلام کے قانونی نظام معیشت کو منضبط اور محدود سرمایہ داری (managed and controlled capitalism) سے تعبیر کیا ہے' لہٰذا اسی کے حوالے سے میں اس کی وضاحت کروں گا۔ آج کل اس مفہوم کو داخلی منضبط سرمایہ داری (internally managed capitalism) کے الفاظ سے ادا کیا جا رہا ہے۔ اصل سرمایہ داری (capitalism) تو یہ ہے



کہ میرا سرمایہ ہے اور میرے یہ شرائط وضوابط (terms and conditions) ہیں' آپ کام کرنا چاہیں تو کیجیے' نہیں کرنا چاہتے تو مت کیجیے۔ اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی ذہن میں رکھیں کہ یہ میرا اختیار ہے اور میں اس میں آزاد ہوں کہ جب چاہوں کارخانہ بند کر سکتا ہوں۔ آپ کو بھی کام کرنے یا نہ کرنے کی آزادی ہے۔ اب اس نظام سے ''مترفین'' یعنی haves اور ''محرومین'' یعنی have-nots کے درمیان تقسیم بڑھنی شروع ہوئی تو سرمایہ داروں کو خود بخود ایک خطرے کا احساس ہوا کہ یہ پریشان بے روزگار زیادہ بپھر گئے تو کہیں ہماری تجوریوں پر نہ ٹوٹ پڑیں اور ہمارے محلات پر حملہ آور نہ ہو جائیں۔ لہٰذا ان کو کچھ نہ کچھ خیرات دی جائے اور یہ جو haves and have-nots کا فاصلہ ہے اسے کسی نہ کسی درجے میں کم کیا جائے۔ سرمایہ دارانہ نظام کی اس ناگزیر ضرورت کے تحت مغرب کے سرمایہ دارانہ نظام نے مترفین اور محرومین کے اس فاصلے کو کم کرنے کے لیے مختلف کوششیں کیں۔ چنانچہ ایک طرف ٹریڈ یونینز قائم ہوئیں کہ مزدوروں کے حقوق کا تحفظ کیا جائے اور دوسری طرف بے روزگاری (unemployment) الاؤنس کا اجرا کیا گیا کہ کم سے کم گزارہ (subsistance) الاؤنس تو آدمی کو ملے تاکہ وہ معاملہ طے کرنے (bargaining) کی پوزیشن میں ہو اور وہ کارخانہ دار اور سرمایہ دار کے ساتھ پاؤں جما کر تو بات کر سکے کہ تم میری صلاحیت اور محنت کے بقدر صحیح اجرت دو گے تو کام کروں گا ورنہ نہیں کروں گا۔ مجھے یہ خطرہ نہیں ہے کہ کل میرے بچے کو فاقہ آ جائے گا' اس لیے کہ مجھے بے روزگاری الاؤنس مل جائے گا جو ریاست کے ذمے ہے۔ اسی کو امریکہ اور بعض یورپی ممالک میں اجتماعی بہبود (ویلفیئر) کے نام سے جاری کیا گیا ہے کہ بے گھروں کو گھر دینا اور بنیادی ضروریات کی فراہمی حکومت کے ذمے ہے۔ اس کا بھی بنیادی مقصد یہی ہے کہ آپ مزدور کو ایک bargaining پوزیشن دے دیں کہ اگر آپ کو صحیح اجرت پر صحیح کام مل رہا ہے تو کریں' اگر نہیں مل رہا تو انکار کر دیں۔ اس پر آپ سے یہ نہیں پوچھا جائے گا کہ کم پر کیوں کام نہیں کرتے؟ ہم سرمایہ داروں کے سرمائے پر ٹیکس لگا کر اتنا جمع کر لیں گے کہ تمہاری بنیادی ضروریات پوری کر سکیں۔

''Give the devil his due'' کے مصداق ہمیں یہ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ سیکنڈے نیوین سوشلزم میں ویلفیئر سٹیٹ کا یہ تصور اپنی اعلیٰ ترین شکل کو پہنچ گیا ہے اور واقعتاً ایک اعتبار سے انسان معراجِ انسانیت پر پہنچ گیا ہے۔ ایک طرف کروڑوں اربوں کا مالک ہے جو لاکھوں

ڈالرز میں ٹیکس دے رہا ہے اور ایک طرف ایک آدمی ویلفیئر الاؤنس پر زندگی بسر کر رہا ہے' لیکن ان دونوں کی اولاد ایک سطح پر تعلیم پائے گی' علاج دونوں کا ایک لیول کا ہوگا' یعنی علاج اور تعلیم ریاست کے ذمے ہے اور وہ بچے ایک فرد کے نہیں بلکہ قوم کی امانت اور ملکیت ہیں۔ اس اعتبار سے تو یہ بہت اعلیٰ نظام معلوم ہوتا ہے مگر بعض پہلوؤں سے اس میں بہت ہی پستی ہے۔ اس معاشرے میں عائلی اور معاشرتی نظام درہم برہم ہوگیا ہے اور خاندان کا ادارہ ٹوٹ پھوٹ کر رہ گیا ہے۔ عورت کی حرمت جس طرح وہاں پامال ہوئی ہے پوری دنیا میں کہیں نہیں ہوئی۔ جنسی بے راہروی کا جو طوفان وہاں آیا ہے اور کہیں نہیں آیا۔ پھر یہ کہ خودکشیاں سب سے زیادہ وہاں ہو رہی ہیں جہاں ویلفیئر کا نظام اپنی اس انتہا کو پہنچ گیا ہے۔ اس کا سبب وہی ہے کہ ان کا عائلی نظام درہم برہم ہوگیا ہے۔ قرآن مجید نے عائلی نظام کا ایک ہدف یہ بھی بتایا ہے: ﴿لِتَسْكُنُوْٓا اِلَيْهَا﴾ (الروم: ۲۱) یعنی یہ ازدواجی نظام ذہنی تسکین کا بہت بڑا ذریعہ ہے۔ اگر وہاں سکون ہو' اطمینان ہو' باہمی اعتماد ہو' تو پھر کسی سکون آور یا خواب آور دوائی کی بھی ضرورت نہیں ہوگی۔ جب وہاں تسکین نہیں ہے تو خودکشیاں تو ہوں گی کیونکہ یہی چیز ہے جو انسان کے لیے سب سے زیادہ سوہانِ روح بنتی ہے۔ یہ پستی کی انتہا ہے۔ بہرحال یہ تسلیم کیا جانا چاہیے کہ سیکنڈے نیوین ممالک میں ایک بار یہ نظام اپنی ناقابل یقین حد تک پہنچ گیا تھا' تاہم چونکہ یہ معاملہ غیر فطری اور غیر طبعی تھا اس لیے کسی قدر نیچے اترنے پر مجبور ہوگیا۔ امریکہ اس اعتبار سے بہت دُور ہے' اس لیے کہ امریکہ میں تو آپ کو علاج بھی خریدنا پڑتا ہے اور تعلیم بھی خریدنی پڑتی ہے' آپ کو بڑی بھاری فیسیں دینی پڑتی ہیں۔ یہ ہے سرمایہ دارانہ نظام کا اندرونی انضباط (internally management)۔

## اسلام میں زکوٰۃ کا نظام اور اس کی برکات

اسلام کے قانونی معاشی نظام میں یہ management زکوٰۃ کے نظام کے ذریعے سے قائم ہوتی ہے۔ یعنی اسلام نے یہی شے اس سے بہتر انداز میں عطا کی ہے۔ اسلام نے ایک حد قائم کر دی کہ جو اس حد سے آگے نکل جائیں وہ دینے والے (doners) ہیں اور جو اس حد سے پیچھے رہ جائیں وہ لینے والے (recipients) ہیں۔ دینے والوں کو haves اور لینے والوں کو have-nots شمار کریں یا دین کی اصطلاح میں ان کو بالترتیب ''صاحبِ نصاب'' اور ''مسکین'' شمار کریں۔ حضور ﷺ نے زکوٰۃ کے بارے میں فرمایا: ((تُؤْخَذُ مِنْ



اَغْنِيَاءِ هِمْ وَتُرَدُّ عَلٰى فُقَرَاءِ هِمْ))[1] ''وہ (زکوٰۃ) مسلمانوں کے مالداروں سے وصول کی جائے گی اور غرباء میں تقسیم کی جائے گی''۔ معاشرے میں معاشی اعتبار سے پیدا ہونے والی ناہمواری کو کم کرنے کے لیے اسلام نے زکوٰۃ کا مکمل نظام قائم کیا ہے۔ اس میں نصاب کی حد مقرر کی گئی ہے اور پھر اس میں مقداریں ہیں۔ یوں سمجھئے کہ چودہ سو برس قبل معاشی فرق و تفاوت کو کم کرنے کی ضرورت اسلام نے زکوٰۃ کے نظام سے پوری کر دی تھی۔ اس لیے کہ اسلام میں بھی آزاد معیشت ہے اور جہاں بھی آزادی ہوگی وہاں کچھ نہ کچھ فرق ضرور آئے گا۔ اس فرق کو زکوٰۃ اور عشر کے نظام کے ذریعے کم کیا گیا ہے۔ اسلام کے نظامِ معیشت کے ''اندرونی انضباط'' اور سرمایہ دارانہ نظام کے اندرونی انضباط (internally management) میں بہت فرق ہے۔ ایک فرق یہ ہے کہ صاحبِ نصاب اور مسکین کی تقسیم الل ٹپ (arbitrary) نہیں ہے۔ اسے آپ اپنے اختیار سے آگے پیچھے نہیں کر سکتے۔ ''فقیر'' کے لفظ سے ذرا مغالطہ ہو جاتا ہے کہ فقیر شاید وہی ہے جو ہاتھ پھیلا رہا ہو' مانگ رہا ہو اور جسے فاقہ آ رہا ہو۔ حقیقت میں ایسا نہیں ہے۔ اسلام میں نصاب کی ایک لائن کھینچ دی گئی ہے کہ جس کے پاس ساڑھے سات تولے سونا یا باون تولے چاندی ہے وہ اس لائن سے اوپر ہے اور زکوٰۃ کا ادا کنندہ ہے اور جس کے پاس اتنا سونا یا چاندی نہیں ہے وہ اس لائن سے نیچے ہے اور زکوٰۃ کا وصول کنندہ ہے۔ اسی طرح اونٹ' گھوڑے اور بھیڑ بکریوں کا نصاب ہے۔ اب جو اس سے اوپر ہیں وہ غنی ہیں' اور جو نیچے رہ گئے ہیں وہ فقیر ہیں۔

ان دونوں نظاموں میں دوسرا اور اہم ترین فرق یہ ہے کہ اسلام کی اخلاقی تعلیم جہاں انفاق یعنی خرچ کرنے پر زور دیتی ہے وہاں اس کا ایک تکمیلی جزو (counter part) یہ ہے کہ کسی کے سامنے ہاتھ پھیلانے اور سوال کرنے کو انتہائی مذموم اور صدقات کو ''اَوْسَاخُ النَّاسِ'' (لوگوں کا میل کچیل) قرار دے کر نہ صرف لوگوں کو ترغیب دی ہے بلکہ غیرتِ انسانی کو بھی جھنجھوڑا گیا ہے کہ زکوٰۃ و صدقات کو مت قبول کرو۔

غیرتِ فقر مگر کر نہ سکی اس کو قبول
جب کہا اُس نے یہ ہے میری خدائی کی زکوٰۃ!

(۱) صحیح البخاری' کتاب الزکاۃ' باب وجوب الزکاہ- و صحیح مسلم، کتاب الایمان، باب الدعاء الی الشھادتین و شرائع الاسلام۔

ایک غیرتِ فقر بھی ہے کہ محنت اور کوشش کر کے اپنے پاؤں پر کھڑے ہو‘ روکھا سوکھا کھاؤ مگر سوال مت کرو اور لوگوں کے ہاتھوں کی میل کچیل سے اپنے پیٹ مت بھرو۔ ہم نے اس طرف بہت کم توجہ کی ہے۔ یہ اصل فرق ہے جس کی وجہ سے آج سیکنڈے نیوین سوشلزم اپنی بربادی تک پہنچ گیا ہے۔ اس لیے کہ جب بنیادی ضروریاتِ زندگی بغیر محنت کے حاصل ہو رہی ہوں تو کام کا محرّک (incentive) کیوں رہے گا؟ انسان کو حیرت ہو سکتی ہے کہ ویلفیئر کا ایسا نظام ہے تو ان کی آمدنی کیا ہے؟ یہ ملک کیسے چل رہے ہیں؟ اس کا جواب یہ ہے کہ یہ ملک اس لیے قائم چلے آ رہے ہیں کہ وہ اپنے دفاع پر ایک پیسہ بھی خرچ نہیں کر رہے۔ جب جرمنی نے وہاں قدم جمانے چاہے تھے تو انہوں نے بالکل کھلم کھلا کہہ دیا تھا کہ آئیے اور ہمارا ملک سنبھالیے۔ ان کا پورے کا پورا ڈیفنس امریکہ کے ہاتھ میں ہے۔ امریکہ پوری تھرڈ ورلڈ کا پیسہ چوس رہا ہے اور اس کے بل بوتے پر وہ اپنی اکانومی کی بساط بچھائے بیٹھا ہے۔ ان ممالک میں اگر دفاع کے اوپر اس طرح کا خرچ ہونے لگے جس طرح باقی ممالک میں ہوتا ہے تو ان کا ویلفیئر سٹیٹ کا نظام کبھی بھی چل نہیں سکتا۔

اسلام نے معاشرے میں مالی فرق وتفاوت کو کم کرنے کے لیے ایک طرف زکوٰۃ کا نظام رائج کیا ہے تو دوسری طرف لوگوں کو اس سے دور رہنے کی تلقین کی ہے۔ ایک طرف قرآن نے فرمایا: ﴿وَفِیْٓ اَمْوَالِهِمْ حَقٌّ مَّعْلُوْمٌ ۝۲۴ لِّلسَّآئِلِ وَالْمَحْرُوْمِ ۝۲۵﴾ (المعارج) ’’ان کے مالوں میں معیّن حق ہے سائل کے لیے بھی اور محرومین کے لیے بھی‘‘۔ دوسری جگہ فرمایا: ﴿وَاَمَّا السَّآئِلَ فَلَا تَنْهَرْ ۝۱۰﴾ (الضحیٰ) ’’کسی سائل کو مت دھتکارو‘ مت جھڑکو‘‘ — کہیں باقاعدہ ایک مد معیّن کی جاتی ہے: ﴿وَاٰتَی الْمَالَ عَلٰی حُبِّهٖ ذَوِی الْقُرْبٰی وَالْیَتٰمٰی وَالْمَسٰكِیْنَ وَابْنَ السَّبِیْلِ ۙ وَالسَّآئِلِیْنَ وَفِی الرِّقَابِ ۚ﴾ (البقرۃ:۱۷۷) ’’اور اُس نے دیا مال اس کی محبت کے باوجود قرابت داروں‘ یتیموں‘ محتاجوں‘ مسافروں اور مانگنے والوں کو اور گردنوں کے چھڑانے میں‘‘۔ اس سے ایک اشتباہ ہوتا ہے کہ شاید اسلام مانگنے اور سوال کرنے کی حوصلہ افزائی کر رہا ہے۔ یہاں اسلام کی تعلیمات کے دوسرے پہلو کو بھی سامنے رکھیں کہ اسلام میں سوال کرنے کی انتہائی مذمّت ہے۔ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: ((اَلْیَدُ الْعُلْیَا خَیْرٌ مِّنَ الْیَدِ السُّفْلٰی))(۱) ’’دینے والا ہاتھ بہتر ہے لینے والے ہاتھ سے‘‘۔ بہتر بنو کہتر کیوں بنتے ہو؟ اور دوسری طرف

(۱) صحیح البخاری‘ کتاب الزکاۃ‘ باب لا صدقۃ الا عن ظھر غنی۔ وصحیح مسلم‘ کتاب الزکاۃ‘ باب بیان ان الید العلیا خیر من الید السفلی .....



ان صدقات کو لوگوں کا میل کچیل قرار دیا۔

ان دونوں پہلوؤں کو سامنے رکھیے تو معلوم ہوگا کہ اسلام میں سوال کرنے کی کوئی حوصلہ افزائی نہیں ہے۔ چنانچہ آپ نے وہ واقعات سنے ہوں گے کہ اسلامی تاریخ میں وہ وقت آ گیا تھا جس میں خوشحالی کی ایک انتہا کا نقشہ نظر آتا ہے کہ لوگ اموالِ زکوٰۃ لیے پھرتے تھے اور لینے والا کوئی نہیں تھا۔ اس میں ایک اشکال یہ ہو جاتا ہے کہ خلافت راشدہ میں تو حکومتی سطح پر مال کی زکوٰۃ وصول کی جاتی تھی تو یہ لوگ کیسے زکوٰۃ کا مال لیے پھرتے تھے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ دور خلافتِ راشدہ میں اموالِ باطنہ کی زکوٰۃ خود دینی ہوتی تھی جبکہ اموالِ ظاہرہ کی زکوٰۃ کی وصولی ریاست اور حکومت کی سطح پر ہوتی تھی۔ اب لوگ اموالِ باطنہ کی زکوٰۃ دینے کے لیے پھر رہے ہوتے اور لینے والا کوئی نہ ملتا۔ اس میں یقیناً ایک پہلو یہ بھی ہے کہ جس تیزی سے فتوحات ہوئیں اور مالِ غنیمت آیا اس سے عمومی خوشحالی پیدا ہو گئی‘ تو اب کون ہے جو اس کو قبول کرنے والا ہو؟ لیکن اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی ہے کہ ان پر اخلاقی تعلیمات کا بھی کافی اثر تھا۔ پھر اس معاملے میں مزید زور پیدا کرنے کے لیے نبی اکرم ﷺ نے اپنی ذات اور اپنے خاندان کے لیے زکوٰۃ اور صدقات کو حرام قرار دے دیا‘ البتہ ہدیہ کو جائز قرار دیا۔ یہ وہ بنیادی بات اور بنیادی پہچان تھی جو ایک عیسائی راہب نے حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ کو بتائی تھی کہ نبی آخر الزماں ﷺ کی ایک پہچان یہ ہوگی کہ وہ صدقہ قبول نہیں فرمائیں گے‘ البتہ ہدیہ قبول کر لیں گے۔

اس تمام گفتگو سے یہ اندازہ ہو گیا ہے کہ اسلام نے مترفین اور محرومین کے مابین مالی فرق وتفاوت کو کم کرنے کی غرض سے اپنے معاشی نظام کی management کے لیے زکوٰۃ اور عشر وغیرہ کا اہتمام کیا ہے۔ اس کو آپ اجتماعی (collective) انشورنس بھی کہہ سکتے ہیں۔ اسی کی بنیاد پر اسلامی ریاست اپنے شہریوں کی بنیادی ضروریات کی کفیل ہے۔ اس کو آپ subsistance allowance کہہ لیں‘ unemployment allowance کہہ لیں یا ویلفیئر کہہ لیں‘ کہ بنیادی ضروریات کی ذمہ دار ریاست ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ اسلامی ریاست فی الحقیقت ایک ویلفیئر سٹیٹ کی صورت اختیار کر لیتی ہے جو ’’کفالتِ عامہ‘‘ کی ذمہ داری جس حد تک قبول کرتی ہے اس کا کسی قدر اندازہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے اس قول سے کیا جا سکتا ہے کہ ’’اگر دجلہ وفرات کے کنارے کوئی کتا بھی بھوکا مر گیا تو قیامت کے روز اس کی ذمہ داری بھی عمر پر ہوگی۔‘‘

یہاں یہ بھی نوٹ کرلیں کہ اگر کوئی شخص اپنی عزتِ نفس اپنی ہتھیلی پر رکھ کر تمہارے سامنے پیش کر دے‘ تمہارے سامنے دست سوال دراز کرے اور پھر بھی تم اس کو ٹھکرا دو تو یہ تمہاری شرافت اور مروّت کے منافی ہے۔ کچھ دے سکتے ہو تو ضرور دو۔ بعض احادیث میں یہاں تک الفاظ آئے ہیں کہ سائل کو دو چاہے وہ گھوڑے پر سوار ہو کر آیا ہو۔ تمہیں کیا معلوم اس کے کیا حالات ہیں، اگر نہیں دے سکتے تو اچھے انداز میں رخصت کر دو لیکن دھتکارنے کی‘ جھڑکنے کی اجازت نہیں ہے۔

## اسلام میں محدود سرمایہ کاری اور سرمائے کے بارے میں اسلامی فلسفہ

یہاں ایک اور بات ہے جو مشکل تر ہے‘ اور جس تک ابھی مغربی ذہن بالکل نہیں پہنچا‘ وہ ہے ’’محدود سرمایہ کاری‘‘ (controlled capitalism)۔ محدود سرمایہ کاری کا تصور اسلام نے دیا ہے کہ جائز ذرائع سے حاصل کی گئی کمائی حلال اور ناجائز ذرائع سے حاصل کی گئی کمائی حرام ہے۔ اس طرح کا کوئی تصور مغرب میں ابھی نہیں ہے۔ چنانچہ انٹرسٹ ریٹ بڑھتا جا رہا ہے‘ افراطِ زر (inflation) بڑھتا جا رہا ہے۔ ایک دائرہ خبیثہ (vicious circle) ہے جو پھیلتا جا رہا ہے‘ تباہی نظر آ رہی ہے لیکن ان کے پاس اس کا کوئی حل نہیں ہے۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا کیسے کریں‘ اسے کس طریقے سے نیچے لائیں۔ اس کا حل وہ ہے جو درحقیقت اسلام نے دیا ہے‘ یہاں سوائے اس آسمانی ہدایت کے کوئی اور شے انسان کو بچانے (rescue) کے لیے آنے والی نہیں۔ سرمائے کے حوالے سے اسلام کا بنیادی فلسفہ یہ ہے کہ سرمایہ کو زنجیریں پہنانی ہیں‘ سرمایہ کے پاؤں میں بیڑیاں ڈالنی ہیں‘ سرمائے کے ہاتھ میں کچھ ہتھکڑیاں ڈالنی ہیں‘ کچھ پابندیوں (limitations) کے ساتھ اسے آزادی دینی ہے‘ لیکن اہل مغرب نے اس سرمائے کو مادر پدر آزادی دی‘ جس سے بڑی لعنت اور کوئی ہو نہیں سکتی۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اپنی آنکھوں سے تباہی دیکھ رہے ہیں‘ خاندانی نظام بکھرتے دیکھ رہے ہیں‘ اکانومی ڈوبتے دیکھ رہے ہیں‘ لیکن کر کچھ نہیں سکتے۔ اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ انہوں نے سرمائے کو بغیر کسی پابندی کے مکمل آزادی دے دی۔

اسلام کے سماجی اور معاشرتی نظام میں مَیں نے ایچ جی ویلز کی تصنیف ’’A Concise History of the World‘‘ کا تذکرہ کیا تھا۔ اس نے تسلیم کیا کہ انسان کی حریت‘ اُخوت اور مساوات کے وعظ تو پہلے بھی دنیا میں کہے گئے تھے لیکن یہ ماننا پڑتا ہے کہ



انسانی آزادی‘ اخوت اور مساوات (Human freedom, fraternity and equality) کے اصولوں پر بالفعل ایک معاشرہ تاریخ انسانی میں پہلی مرتبہ محمد رسول اللہ ﷺ نے قائم کیا ہے۔ اسی طرح کی ایک عجیب بحث اس نے سرمایہ اور کرنسی سے متعلق بھی کی ہے کہ یہ کرنسی اور سرمایہ بہت بڑی لعنت ہے۔ اس نے کہا کہ اس کا آغاز رومن امپائر سے ہوا تھا۔ جب تک کرنسی کا تصور نہیں تھا دنیا میں لین دین ہو رہے تھے لیکن تبادلے کی بنیاد پر۔ یعنی اس سے پہلے مبادلۂ اشیاء کا اصول تھا کہ ایک شخص کھیت میں کام کر رہا ہے اور گندم اُگا رہا ہے‘ دوسرا کرگے پر بیٹھا کپڑا بُن رہا ہے۔ وہ دونوں اپنی ضرورت کے مطابق اشیاء ایک دوسرے سے تبادلہ (exchange) کر لیتے تھے —— یعنی تم دو بوری گندم لے لو اور دو تھان کپڑے کے مجھے دے دو —— اس طرح مبادلۂ اشیاء سے ضروریات پوری ہو رہی تھیں‘ لیکن کہیں ارتکازِ سرمایہ کی شکل نہیں تھی۔ کوئی کتنا کپڑا اپنے پاس جمع کر لے گا اور کوئی کتنی گندم اپنے پاس روک لے گا؟ لہٰذا ارتکازِ سرمایہ کی جو بہت بڑی قوت ہے یہ اس وقت نہیں تھی۔ جب آپ نے کرنسی کا تصور دیا کہ ایک تولہ سونا مساوی ہے اتنے من گندم کے اور ایک تولہ مساوی ہے اتنے تھان کپڑے کے‘ تو اب ایک نئی شے انسانی معاشرے کے اندر متعارف ہوئی۔ گویا اس سے انسان کے ہاتھ ارتکازِ دولت کا ایک ذریعہ آ گیا۔ سرمایہ دار کی تجوری کے اندر سونے کی صورت میں ایک بہت بڑا جن بند ہے‘ اس جن کو وہ release کرے گا اور مارکیٹ کو اِدھر سے اُدھر کر دے گا۔ وہ کوئی ایک مال خرید لے گا اور مارکیٹ کے اندر اس کی کمی پیدا کر کے قیمتیں چڑھا دے گا اور پھر من مانی قیمت وصول کرے گا۔ ابھی کچھ عرصہ پہلے سٹاک مارکیٹ کے اندر زلزلہ آیا تھا‘ اس سے لوگوں کے کروڑوں‘ اربوں ڈالر آنِ واحد میں ختم ہو گئے۔ یہ سارا کھیل سرمائے کا ہے اور سرمائے کا ارتکاز اس کرنسی اور اس دولت کے سبب سے ہے۔ ایچ جی ویلز نے اس کے بارے میں صرف ایک جملہ لکھا کہ انسان کو معلوم نہیں تھا کہ اس کرنسی کی ایجاد سے اس نے کتنی بڑی لعنت کا طوق اپنے گلے میں ڈال لیا ہے۔ اس کے بارے میں آپ سمجھ لیجیے کہ یہ ایک شر ہے لیکن ناگزیر شر ہے‘ ناگزیر برائی ہے۔ لہٰذا اس کو استعمال بھی کیا جائے‘ اسے کچھ کام کرنے کی آزادی (freedom of action) بھی دی جائے اور اس کو کچھ پابند بھی کیا جائے۔ یہ ہے اصل فلسفہ اسلام کا۔ اب دیکھئے کہ اسلام نے سرمائے کو کس طرح پابند کیا ہے۔

## سرمایہ‘ محنت اور موقع

بنیادی طور پر کسی بھی معاشی پیداواری عمل (economic productive activity) میں تین چیزیں شامل ہیں: ایک سرمایہ‘ دوسری محنت ۔ اصل تو یہ دونوں ہی ہیں لیکن ان کے ساتھ ایک تیسرا عامل بھی ہوتا ہے اور وہ ہے موقع (chance)—— کبھی اتنا ہی سرمایہ اتنی ہی محنت کے ساتھ زیادہ پیداوار لے آتا ہے اور کبھی اتنا ہی سرمایہ اور اتنی ہی محنت صرف ہوتی ہے اور پیداوار کم ہوتی ہے یا پیداوار بالکل صفر ہوتی ہے۔ اب سرمایہ بھی وہی ہے‘ محنت بھی وہی ہے‘ لیکن یہ چانس کا عنصر بھی ایک مؤثر عامل ہے —— اب اسلام نے معاشی معاملات کے اندر ان تینوں میں سے سب سے زیادہ تحفّظ اور سب سے زیادہ عزت‘ محنت کو دی ہے جبکہ سرمائے کی حیثیت کم سے کم رکھی ہے۔ اور اگر سرمائے کو صرف اپنی ذاتی حیثیت میں کمائی کا ذریعہ (earning agent) بنا دیا جائے تو اسلام کی نظر میں یہ غلط ہے۔ اس کی بدترین شکل سود اور ربا ہے جو اسلام میں حرام ہے۔ یعنی اسلام نے سرمائے کو بیڑیاں ڈالی ہیں‘ اسے پابند کیا ہے۔ اسی طرح اسلام نے چانس کو بھی کم سے کم درجہ دیا ہے۔ چنانچہ جوئے کو حرام قرار دیا گیا ہے۔ اس لیے کہ جس کو آپ جوا کہتے ہیں‘ وہ اصل میں صرف چانس ہے اور کچھ بھی نہیں۔ نہ آپ کی محنت ہے اور نہ آپ کا سرمایہ اس کے اوپر لگا ہے‘ جو کچھ ہو رہا ہے وہ صرف چانس کا معاملہ ہے جو حرامِ مطلق ہے۔

## سود کی حرمت و شناعت

اسلام نے سرمائے پر جو پابندیاں عائد کی ہیں‘ ان میں ایک درجہ بندی ہے۔ سرمائے کی مادر پدر آزادی یہ ہے کہ: (i) سرمایہ محض بطور سرمایہ earning agent ہو یعنی بغیر کسی محنت کے صرف سرمایہ ہونے کی حیثیت سے کمائی کا ذریعہ بنے (ii) سرمایہ اپنا تحفظ بھی چاہے (iii) پھر وہ نقصان کا risk لینے کو تیار نہ ہو‘ صرف نفع مانگے (iv) اور نفع بھی ایک معیّن سطح پر مانگے۔ یہ چار عناصر سود اور ربا کے اجزائے لاینفک ہیں‘ جسے اسلام نے اس درجے حرام کیا ہے کہ کسی اور شے کی حرمت ایسی نہیں ہے۔ یعنی یہ کڑوی گولی نہیں گولہ ہے‘ جس کو ھَنِیْئًا مَّرِیْئًا ہم سب کھا رہے ہیں‘ پی رہے ہیں‘ مچھلیوں کی مانند اس میں تیر رہے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ کی ایک حدیث کا مفہوم ہے کہ ایک زمانہ ایسا آئے گا کہ اگر کوئی انسان سود سے بچ بھی جائے گا تو سود کے دھوئیں سے نہیں بچ سکے گا۔ dust suspension فضا میں موجود ہے تو آپ لامحالہ



اسے inhale کریں گے۔ یہ سود اتنی بڑی لعنت ہے‘ اتنا بڑا گناہ ہے کہ زنا سے بھی بڑھ کر ہے۔ آپ یوں سمجھئے کہ عقائد میں شرک اور اعمال میں سود سب سے بڑا گناہ ہے۔ قرآن کے سب سے بڑے رمز شناس حضرت محمد رسول اللہ ﷺ نے سود کی حرمت بیان کرنے کے لیے جو انداز اختیار کیا وہ ہماری ذہنی سطح سے قریب تر ہے۔ آپؐ نے ارشاد فرمایا:

((اَلرِّبَا سَبْعُوْنَ حُوْبًا اَیْسَرُھَا اَنْ یَّنْکِحَ الرَّجُلُ اُمَّہٗ)) (۱)

’’سود کے ستر حصے ہیں‘ ان میں سب سے ہلکا اس کے مساوی ہے کہ کوئی شخص اپنی ماں سے زنا کرے۔‘‘

اس سے ایک دفعہ آدمی لرز جاتا ہے بلکہ طبیعت اِبا بھی کرتی ہے کہ حضور ﷺ نے ایسی بات کیوں کہی‘ یہ اندازِ تعبیر آپ نے کیوں اختیار کیا؟ فوری طور پر احساس ہوتا ہے کہ کچھ ناشائستہ سا انداز ہے تعبیر کا۔ اس حوالے سے یہ بات نوٹ کر لیں کہ سود کی قباحت‘ اس کی شناعت‘ اس کی خباثت کا جو تاثر دینا مقصود تھا وہ اس کے بغیر ممکن ہی نہیں تھا۔ دوسری بات یہ ہے کہ انسان کو بہت سے گناہوں سے طبعی نفرت ہوتی ہے۔ خصوصاً ہمارے ہاں ایک نام نہاد ’’دیندار‘‘ مگر اصلاً ’’کاروباری‘‘ طبقہ کو نماز روزے سے بڑی دلچسپی ہے‘ حج کرنا ان کا محبوب مشغلہ ہے اور دارالعلوم و مساجد بظاہر قائم ہی ان ہی کے بل بوتے پر ہیں‘ شراب سے ان کو بڑی نفرت ہے اور اگر اس پر زنا کا اضافہ ہو جائے تو گویا قیامت آ گئی‘ مگر ان کو سود سے کوئی نفرت نہیں اور وہ بڑے ذوق و شوق سے سودی کاروبار کرتے ہیں۔ لہٰذا نبی اکرم ﷺ نے یہ اندازِ تعبیر اختیار فرمایا تاکہ واضح ہو جائے کہ سود معاشرتی برائی ہونے کے اعتبار سے زنا کی بدترین صورت (یعنی ماں کے ساتھ زنا) سے بھی ستر گنا زیادہ بھیانک ہے۔

اس اندازِ تعبیر کی مثال قرآن مجید میں بھی موجود ہے کہ غیبت کو مردہ بھائی کا گوشت نوچنے سے تعبیر کیا گیا ہے: ﴿اَیُحِبُّ اَحَدُکُمْ اَنْ یَّاْکُلَ لَحْمَ اَخِیْہِ مَیْتًا فَکَرِھْتُمُوْہُ ؕ﴾ (الحجرات:۱۲) ’’کیا تم میں سے کوئی یہ پسند کرتا ہے کہ وہ اپنے مُردہ بھائی کا گوشت کھائے؟ پس تم اس کو ناپسند کرتے ہو‘‘۔ آدمی کی طبیعت ایک دفعہ اِبا کرتی ہے کہ کیسی تمثیل دی گئی ہے‘ کوئی شخص اس کا تصوّر بھی نہیں کر سکتا‘ لیکن اخلاقی میدان میں کسی کی غیبت بالکل اس کے مساوی ہے جیسے ایک مردہ اپنے گوشت کا دفاع نہیں کر سکتا‘ ایسے ہی جو شخص موجود نہیں ہے وہ

(۱) سنن ابن ماجہ‘ کتاب التجارات‘ باب التغلیظ فی الربا۔

اپنی عزت کا دفاع نہیں کرسکتا اور آپ اس کی غیبت کر رہے ہیں۔ وہ موجود ہو پھر اس کی برائی کر کے دیکھئے‘ وہ اپنا دفاع کرے گا۔ چنانچہ غیبت درحقیقت مساوی ہے اپنے مردہ بھائی کا گوشت کھانے سے۔ اسی طرح طبعی طور پر ہمیں سود سے وہ نفرت نہیں ہے‘ لیکن زنا کا لفظ بھی ایک شائستہ آدمی زبان سے بار بار کہتے ہوئے اچھا محسوس نہیں کرتا‘ کجا یہ کہ ماں سے زنا کی بات کی جائے۔ تو گویا سُود اشدّ الحرام اور ابغض الحرام ہے۔ طلاق کے بارے میں حضور ﷺ نے فرمایا: ((اَبْغَضُ الْحَلَالِ اِلَی اللّٰہِ تَعَالٰی الطَّلَاق))(۱) یعنی حلال چیزوں میں اللہ کو سب سے زیادہ ناپسندیدہ طلاق ہے‘ جبکہ سود تو حرام میں بھی ابغض الحرام ہے۔

## اسلام کا نظریہ قدرِ زائد

دنیا میں قدرِ زائد (surplus value) کا تصور بہت عام ہے‘ خاص طور پر مارکس کے نظریے میں۔ قرآن مجید نے قدرِ زائد کے لیے ایک لفظ استعمال کیا ہے ’’عفو‘‘ یعنی جو تمہاری ضرورت سے زائد ہے۔ اس عفو کا مصرف کیا ہے؟ آپ سادہ ترین مثال کو سامنے رکھیے اسی سے باتیں سمجھ میں آتی ہیں اور پھر اس سے پیچیدہ گتھیاں حل ہوتی ہیں —— فرض کیجیے آپ سرکاری ملازم ہیں‘ آپ کو تنخواہ مل رہی ہے جس سے آپ کی ضروریات پوری ہو رہی ہیں اور کچھ آپ بچت کر رہے ہیں۔ وہ بچت جس پر آج بڑا زور دیا جا رہا ہے اور بینکنگ کا پورا نظام اسی کے فلسفے پر اور اسی کی تبلیغ پر چل رہا ہے کہ بچت کرو اور بچت کو پھر کہیں invest کرو۔ آپ کے پاس جو بچت اور فاضل سرمایہ ہے وہ ’’عفو‘‘ ہے۔ اب اس کے دو مصرف ہیں۔

ایک یہ کہ آپ اسے اللہ کی رضا کے لیے خرچ کر دیں۔ جیسے قرآن نے فرمایا: ﴿یَسْئَلُوْنَکَ مَا ذَا یُنْفِقُوْنَ ط قُلِ الْعَفْوَ ط﴾ ’’(البقرۃ:۲۱۹) ’’وہ آپ (ﷺ) سے پوچھتے ہیں کہ کیا خرچ کریں؟ (آپ) کہہ دیجیے: جو ضرورت سے زائد ہو‘‘۔ ☆ یعنی آپ ضرورت سے زائد ان کو دے دیجیے جو ضرورت مند ہیں‘ اس لیے کہ یہ تو ان کی ہی ملکیت تھا۔ یہ میں

(۱) سنن ابی داؤد‘ کتاب الطلاق‘ باب فی کراھیۃ الطلاق۔

☆ بقول اقبال ؎

بامسلماں گفت جاں برکف بنہ ہرچہ از حاجت فزوں داری بدہ

’’مسلمانوں سے کہو کہ جاں ہتھیلی پر رکھ لیں (یعنی قتال فی سبیل اللہ کے لیے کمر کس لیں) اور جو کچھ ضرورت سے زائد ہو وہ سب (اللہ کی راہ میں) دے ڈالیں۔‘‘ (مرتب)



روحانی نظام کی بات کر رہا ہوں کہ یہ درحقیقت انہی کا حق تھا‘ تمہیں تو صرف آزمانے کے لیے دے دیا گیا تھا۔ اگر یہ نہیں کر سکتے‘ اتنا ترفّع ممکن نہیں ہے‘ تمہاری ہمت کی نسبت سے اونچائی کچھ زیادہ ہے تو چلو کسی کو قرضِ حسن کے طور پر دے دو۔ کسی شخص کے پاس سرمایہ نہیں ہے تو آپ اسے قرضِ حسنہ دے دیں‘ اس سے وہ اپنے لیے ایک باعزّت معاش پیدا کر سکتا ہے۔ اسے اگر اتنی سی بھی پونجی مل جائے کہ وہ چھابڑی لے کر چل پڑے یا کوئی کھوکھا لگا لے‘ کوئی دکان بنا لے تو اسے دے دو اور پھر کچھ عرصہ بعد اپنا اصل زر واپس لے لینا۔ یہ دوسرے درجے میں روحانی ترغیب ہے۔ تیسرے نمبر پر یہ ہے کہ اگر تم اپنی اس بچت کو بھی مزید کمائی کا ذریعہ بنانا چاہتے ہو‘ تو قانونی نظام میں اس کا جواز موجود ہے۔ آپ اوپر نہیں جانا چاہتے‘ پستی ہی کی طرف توجہ رکھنا چاہتے ہیں تو قانونی سطح پر اس کے لیے بھی ایک جواز موجود ہے۔ کمزور لوگوں کو بھی شریعت میں accomodate کیا گیا ہے اور ان کے لیے مضاربت کا راستہ کھول دیا گیا ہے۔ آپ اپنا سرمایہ کسی بھائی کو دو‘ وہ کام کرے گا‘ نقصان ہو گیا تو پورے کا پورا آپ کو برداشت کرنا ہوگا‘ اس لیے کہ تمہارا تو یہ زائد مال ہے جبکہ وہ تمہارے سرمائے سے صرف اس لیے کام کر رہا ہے کہ اس کے پاس سرمایہ نہیں ہے‘ اس لیے وہ مال اس کی ضرورت ہے۔ لہٰذا اگر نقصان ہوگا تو کلیتاً تمہارا ہوگا۔ ہاں اگر نفع ہو جائے تو اس میں سے کچھ حصہ تم بھی لے سکتے ہو‘ یہ جائز ہے‘ حلال ہے‘ البتہ پہلے دو درجوں کے مقابلے میں پسندیدہ نہیں ہے۔ اگر آپ اس سے بھی نیچے جائیں گے تو یوں سمجھئے کہ آپ نے اپنے لیے جہنم کا انتخاب کر لیا —— یعنی آپ کسی کو اپنا سرمایہ دے کر کہیں کہ یہ میرا سرمایہ ہے تم کام کرو‘ مجھے اس سے غرض نہیں کہ تمہیں نفع ہو‘ نقصان ہو یا پوری رقم ڈوب جائے‘ میں نے تمہاری گردن پکڑ کر اپنا پیسہ نفع سمیت وصول کر لینا ہے۔ یہ سود ہے جو حرام مطلق ہے۔

## مزارعت

میں عرض کر چکا ہوں کہ اسلام نے قانونی اور فقہی سطح پر مضاربت کو جائز قرار دے کر کم ہمت طبائع کو accomodate کیا ہے۔ ایک شخص کی محنت اور ایک کا سرمایہ‘ ان کے امتزاج کا نام مضاربت ہے۔ نقد کے اوپر تو دو اور دو چار کی طرح بات واضح ہو گئی کہ نقصان ہوا تو سرمایہ دار برداشت کرے گا اور نفع ہوا تو برابر کے شریک ہوں گے۔ اب اس اصول کو زمین پر لائیے جو سب سے بڑا اور سب سے قدیم ذریعۂ پیداوار ہے۔ جیسے مال کا حق ملکیت ہے ایسے

زمین کا بھی ہے‘ کھیت کا بھی ہے۔ اب یہاں ایک صورت یہ ہے کہ آپ اپنی زمین خود کاشت کیجیے‘ یہ تو سب سے اعلیٰ صورت ہے۔ یہاں ایک اور بات بھی یاد رکھیے کہ قرآن مجید میں تجارت کے ساتھ ﴿عَنْ تَرَاضٍ مِّنْكُمْ﴾ (النساء:۲۹) ’’وہ (تجارت) باہم رضامندی سے ہو‘‘ کی شرط عائد کی گئی ہے۔ آپ مل جل کر باہمی رضامندی سے اپنا سرمایہ بھی جمع کر لیں‘ محنت بھی جمع کر لیں تو یہ صورت بھی ٹھیک ہے اور بہت عمدہ شراکت ہے۔ لیکن یہ شراکت اگر زبردستی ہو گی تو پھر آزادی والی بات ختم ہو جائے گی۔ اسی طرح زمین میں شراکت کیجیے‘ collective farming کیجیے اور مل جل کر محنت کیجیے تو یہ ٹھیک ہے‘ مگر اصل مسئلہ وہاں ہے جہاں سرمایہ کسی کا ہے اور کاروبار کوئی اور کر رہا ہے‘ محنت کوئی اور کر رہا ہے۔ اس میں مضاربت تک بہرحال جائز ہے‘ اس سے آگے کا معاملہ سود ہے۔

اسی طرح کا معاملہ مزارعت کا ہے کہ زمین کسی کی‘ کام کوئی اور کرے۔ اس کی جو صورت ’’غیر حاضر زمینداری‘‘ کی ہے یعنی زمین میری ہے باقی سارا کام آپ نے کرنا ہے‘ بیج آپ کا‘ بیل آپ کے‘ ٹریکٹر آپ کا‘ محنت آپ کی‘ میں دعویٰ سے تو نہیں کہہ سکتا لیکن میرے مطالعہ کے مطابق یہ شے تو سب کے نزدیک مطلق حرام ہے‘ اس لیے کہ یہ تو خالص سود ہے۔ امام ابوحنیفہ اور امام مالک رحمہما اللہ کے نزدیک مزارعت کی ہر شکل حرام ہے‘ جبکہ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کی بھی رائے کھلے کھیت کے بارے میں بہت حد تک وہی ہے۔ یہ جو مزارعت کے جواز کا معاملہ ہوا ہے یہ فقہ حنفی میں صاحبین نے اضافی شرطیں لگا کر کیا ہے کہ مالک بیج بھی لگائے اور اس کی کچھ اور بھی investment ہوتا کہ اگر کوئی نقصان ہو‘ فصل خراب ہو جائے تو سارا بوجھ صرف اس مزارع پر نہ آئے بلکہ مالک کا بھی تو کچھ نقصان ہو۔

یہاں یہ بھی غور کیجیے کہ یہ مضاربت کی صورت بن ہی نہیں سکتی‘ اس لیے کہ مضاربت میں تو سارا نقصان رب المال کا ہوتا ہے جبکہ مزارعت میں سارا نقصان زمین والے کا ممکن ہی نہیں۔ اس کی زمین تو جوں کی توں قائم رہے گی۔ ایک فصل ہی گئی ہے نا‘ جبکہ مضاربت میں تو سرمایہ بالکل ختم ہو جاتا ہے۔ زمین میں یہ تو نہیں ہوتا کہ دس ایکڑ تھی اب نو ایکڑ رہ گئی یا آٹھ ایکڑ رہ گئی یا بالکل ختم ہو گئی۔ تو مضاربت کے ساتھ اس کی پوری پوری مشابہت ہو ہی نہیں سکتی۔ یہی وجہ ہے کہ اس کا معاملہ انتہائی مشکوک ہے اور یہ میں ہلکا ترین لفظ (مشکوک) استعمال کر رہا ہوں‘ حالانکہ یہ قریب تر ہے سود کے اور اگر یہ اصول پیش نظر رہے کہ ’’دَعُوا الرِّبَا



وَالرِّيْبَةَ‘‘(۱) یعنی ربا کو بھی چھوڑ دو اور ہر اُس شے کو بھی جس میں ربا کا شبہ ہو تو پھر اس کے قریب بھی نہیں پھٹکنا چاہیے۔

اس محفل میں الحمد للہ مولانا محمد طاسین صاحب تشریف فرما ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ ’’مروّجہ نظامِ زمینداری اور اسلام‘‘ کتاب تصنیف کر کے انہوں نے علماء کی طرف سے ایک بہت بڑا فرضِ کفایہ ادا کیا ہے اور ایک حجّت قائم کر دی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ہمیں سعادت بخشی کہ ہم نے پہلے ’’حکمت قرآن‘‘ میں اسے پندرہ اقساط میں شائع کیا اور بعد ازاں کتابی شکل میں شائع کیا۔ ٹھیک ہے ہمارے ہاں تقلید کا مسئلہ چل رہا ہے‘ فقہ حنفی میں اس کے جواز کا فتویٰ ہے اور عام آدمی بھی اس کے خلاف سننے کے لیے بالکل تیار نہیں ہے تو ظاہر بات ہے کہ زمیندار کیسے سنے گا؟ میں نے ضیاء الحق صاحب مرحوم کی ’’مرحومہ شوریٰ‘‘ جو ان سے کافی پہلے مرحومہ ہو چکی تھی‘ میں کہا کہ کم از کم ایک کمیشن بنائیے‘ جس میں جیّد علماء اور بندوبست اراضی کے ماہرین شامل ہوں اور وہ بیٹھ کر نیا بندوبست اراضی طے کریں کہ شریعت کا تقاضا اور منشا کیا ہے‘ ہمارا دین کیا چاہتا ہے؟ اُس وقت ایک بہت بڑے زمیندار نے کہا کہ آپ یہ کیا کہہ رہے ہیں‘ ہم تو سب حنفی ہیں اور حنفی ہونے کے ناطے مزارعت بالکل جائز ہے۔ میں نے ان سے کہا: کیا آپ کو معلوم ہے کہ امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک مزارعت حرام مطلق ہے؟ کہنے لگے ہمیں نہیں معلوم‘ لیکن حنفی فتویٰ مزارعت کے جواز میں موجود ہے۔

میں نے اسلام کے فلسفے کے حوالے سے دو اصول بیان کیے ہیں‘ ایک یہ کہ سرمائے کو پابند کرنے کی کوشش کرنا اور دوسرا یہ کہ محنت کو تحفظ (protection) فراہم کرنا اور محنت ہی کو اصل شے قرار دینا۔ اگرچہ پروڈکشن میں سرمایہ لازم رہے گا کہ زمین کے بغیر تو کھیتی نہیں

(۱) عَنْ عُمَرَ بْنِ الْخَطَّابِ رضی اللہ عنہ قَالَ:
اِنَّ آخِرَ مَا نَزَلَتْ آيَةُ الرِّبَا وَاِنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وسلم قُبِضَ وَلَمْ يُفَسِّرْ هَالَنَا‘ فَدَعُوا الرِّبَا وَالرِّيْبَةَ (سنن ابن ماجه‘ كتاب التجارات‘ باب التغليظ فى الربا۔ومسند احمد:۲۳۸ و ۳۳۱)
’’حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:
’’بے شک سود کی (حرمت والی) آیت سب سے آخر میں نازل ہوئی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اس حال میں انتقال ہو گیا کہ آپؐ نے ہمیں اس کی تفصیلات بیان نہیں فرمائیں۔ پس تم سود کو بھی چھوڑ دو اور ہر اُس شے کو بھی جس میں سود کا شبہ ہو۔‘‘

ہوگی۔ چنانچہ کچھ نہ کچھ سرمایہ آپ کو ہر کاروبار کے لیے درکار ہے۔ اب یہ بحث کہ سرمایہ پہلے تھا یا محنت پہلے تھی' محنت نے سرمائے کو جنم دیا یا سرمائے نے محنت کو جنم دیا' یہ میرے نزدیک بڑی دقیق فلسفیانہ بحث ہے' جو ہمارے موضوع سے خارج ہے۔ البتہ یہ بات نوٹ کر لیں کہ کسی بھی پیداواری مرحلے میں یہ دونوں چیزیں لازماً لگیں گی۔ اس میں بس زور (emphasis) اس بات پر ہے کہ سرمائے کے ہاتھ ذرا باندھے رکھو اور یہ بہت بڑا جن ہے اس کو بوتل کے اندر بند رکھو' قابو رکھو ورنہ یہ آکاس بیل بن کر پورے معاشرے کے اوپر چھا جائے گا۔ سرمائے کے تحفظ کا منطقی نتیجہ ارتکاز و احتکار کی صورت میں نکلتا ہے اور یہ سرمائے کا ایک ننگا کھیل ہے۔

اسلام سرمائے کے بجائے محنت کو تحفظ دیتا ہے جبکہ سرمایہ داری میں زیادہ تحفظ سرمائے کو دیا جاتا ہے۔ سرمایہ دارانہ نظام میں سرمائے کے تحفظ کی مختلف شکلیں ہیں۔

## انشورنس

یہ سرمائے کا سب سے بڑا تحفظ ہے۔ ایک انشورنس تو لائف انشورنس ہے وہ ایک علیحدہ بحث ہے' میں اس کے بارے میں اس وقت گفتگو نہیں کر رہا۔ انشورنس کا تصور دنیا میں کب سے آیا ہے اور اس کی حقیقت کیا ہے' یہ جان لیں —— بحری جہازوں کے ذریعے تجارت دنیا میں زمانۂ قدیم سے ہوتی رہی ہے۔ ایک تاجر نے لاکھوں روپے کا مال بحری جہاز کے اندر کہیں بھیجا ہے' جہاز ڈوب گیا اور سارا مال ختم ہو گیا۔ اس پر سوچا گیا کہ کچھ نہ کچھ اس کے سرمائے کا تحفظ ہو جائے' وہاں سے یہ تصور چلا ہے۔ اب ہوتا کیا ہے' ایک شخص دس کروڑ سے ایک کارخانہ لگاتا ہے۔ اس کارخانے کے لیے آفاتِ سماویہ کا خطرہ موجود ہے' آگ لگ سکتی ہے' سیلاب آ سکتا ہے اور اس کا مال ختم ہو سکتا ہے' لہٰذا وہ اپنے اس سرمائے کے تحفظ کے لیے اس کی انشورنس کراتا ہے' اور انشورنس کے لیے جو پریمیم ادا کرتا ہے وہ پیداواری قیمت پر ڈال دیتا ہے۔ فرض کیجیے کہ اگر ماچس کا کارخانہ ہے تو اس ماچس کی جو قیمت صارف کو دینی پڑ رہی ہے اس میں دیا سلائی اور اس کے اوپر جو مصالحہ لگا ہے اس کی قیمت بھی شامل ہے' جو لیبر لگی ہے وہ بھی ہے اور اس میں سرمایہ دار کے سرمائے کے تحفّظ کے لیے جو انشورنس کی گئی ہے' اس کا حصّہ بھی شامل ہے' پھر اس کا اپنا نفع بھی ہے۔ اس کے معنی یہ ہوئے کہ سرمایہ دار اپنے سرمائے کا تحفظ صارف کی جیب سے کر رہا ہے۔ جب مل میں آگ لگی' اجتماعی سطح پر قومی دولت کا نقصان ہو گیا' لیکن



سرمایہ دار اس نقصان کو برداشت کرنے کے لیے تیار نہیں۔ یہ ہے سیدھا سیدھا تجزیہ (analysis) اور یہ ہے انشورنس کی اصل حقیقت۔ گویا یہ سرمایہ داروں کی ایک کوآپریٹو ہے' اس کے سوا کچھ نہیں۔ بینکنگ اور انشورنس ساتھ ساتھ اس لیے چلتے رہے ہیں کہ یہ سرمایہ داری کی دو ٹانگیں ہیں جو سرمائے کا تحفظ کرتی ہیں۔

ان تمام چیزوں کو اسلام کے فلسفہ کے حوالے سے حل کریں گے' تو باقی ساری چیزیں بھی خود بخود حل ہو جائیں گی۔ یعنی اسلام سرمائے کو تحفظ نہیں دیتا' اسلام محنت کو تحفظ دیتا ہے اور اس کے ساتھ اسلام سرمائے کو کام کرنے کی کچھ آزادی دیتا ہے لیکن مادر پدر آزادی کی مخالفت کرتا ہے۔

## اوور ٹریڈنگ' فارورڈ ٹریڈنگ

کچھ اور چیزیں جو شریعت نے حرام کی ہیں ان کے بارے میں بھی جان لیجیے۔ مثلاً فارورڈ ٹریڈنگ' مستقبل کا ایسا سودا کرنا جس میں قیمت اور مبیع (مالِ تجارت) دونوں ادھار ہوں۔ یہ تمام ایڈوانس بزنس جو دنیا میں ہوتے ہیں یہ بھی وہی سرمائے کا کھیل ہے۔ اس میں سٹہ (speculation) اور جوئے کا عنصر بھی شامل ہے' اس طرح یہ حرام در حرام ہے۔ یہ بھی انشورنس کی طرح سرمائے کا ننگا ناچ ہے کہ نہ کچھ دیا نہ لیا' نہ مال ابھی تیار ہوا' لیکن سودے اس کے کئی ہو چکے ہیں' کئی ہاتھ بدل چکا ہے' اس کے اوپر نفع کی تہہ چڑھتی جا رہی ہے' جب تک یہ صارف تک پہنچے گا نمعلوم سرمایہ دار نے اس پر کتنا کچھ پیسہ بنا لیا ہوگا۔ پھر یہ کہ اوور ٹریڈنگ ہو رہی ہے' یعنی سرمائے کی لعنت کو آپ نے اور ضرب دے دی۔ ایک شخص کے پاس پانچ لاکھ روپے ہیں اور وہ اوور ٹریڈنگ میں پچاس لاکھ کا مال لے لیتا ہے تو یہ ناجائز ہے۔

اسلام نے فارورڈ ٹریڈنگ کی صرف ایک شکل جائز قرار دی ہے جس کو ''بیع سلم'' کہتے ہیں۔ اگر آپ نے مستقبل کا سودا کرنا ہے تو ٹوٹل رقم (payment) اسی وقت ادا کرنی ہوگی (یا بصورت دیگر قیمت ادھار ہو تو مال فوری سپائی کر دیا جائے) تاکہ کم سے کم اوور ٹریڈنگ نہ ہو اور دوسری طرف مال کی فراہمی بعد میں ہوگی۔ مثلاً آپ کو ایک ہزار من گندم لینی ہے مئی کے مہینے میں' تو آپ وقت سے پہلے سودا کر لیجیے اور فی من قیمت طے کر کے ساری رقم ادا کر دیجیے اور گندم مئی کے مہینے میں لے لیجیے۔ یہ ہے بیع سلم' اس کے علاوہ کوئی اور صورت فارورڈ ٹریڈنگ کی جائز نہیں۔

## آڑھتی (middle-man) اور آڑھت

اسلام کے معاشی نظام میں ایک اور کوشش آڑھتی (middle man) کو درمیان سے

نکالنے کی گئی ہے۔ ایک حدیث ہے جو بار بار پڑھی اور پڑھائی جاتی ہے‘ لیکن اس پر کبھی غور نہیں کیا جاتا۔ میرے ساتھ باقاعدہ لطیفے کے انداز میں ایک واقعہ ہوا ہے۔ میں لاہور کے ایک بڑے عالمِ دین سے ملنے گیا۔ شیخ الحدیث تھے‘ فوت ہو گئے ہیں‘ اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے۔ وہ اس وقت حدیث کا درس دے رہے تھے‘ میں بیٹھ گیا۔ انہوں نے یہ حدیث پڑھی: ((لَا يَبِعْ حَاضِرٌ لِبَادٍ))(۱) ’’کوئی شہر کا آدمی باہر کے آدمی کا مال فروخت نہ کرے‘‘۔ یہ حدیث متعدد طُرق سے روایت ہوئی ہے‘ متن ایک ہی ہے۔ درس ہو گیا‘ دعا مانگ لی‘ طالب علم چلے گئے۔ میں نے مولانا سے کہا کہ اس حدیث کی روشنی میں آڑھت کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟ پہلے تو میں چونکا جب انہوں نے پوچھا کہ آڑھت کیا ہوتی ہے؟ ہوسکتا ہے کہ واقعتاً ان کے علم میں نہ ہو یا تجاہلِ عارفانہ ہو۔ جب میں نے ان کو آڑھت کے بارے میں بتایا کہ سبزیوں‘ اجناس اور پھلوں کی منڈیوں میں آڑھتی اپنا اڈا جما کر بیٹھتا ہے‘ لوگ باہر سے مال لاتے ہیں‘ وہ مال خریدتا نہیں‘ صرف بیچتا ہے اور فروخت کنندہ اور گاہک دونوں کی مجبوری اور لاعلمی سے فائدہ اُٹھاتا ہے اور دونوں سے کمیشن لیتا ہے‘ یعنی بیچنے والے سے بھی اور خریدنے والے سے بھی۔ وہ شیخ الحدیث یہ سن کر فوراً بولے ’’یہ تو مطلقاً حرام ہے‘‘۔ بتایئے کس نے جائزہ لیا کہ ہمارے کاروبار میں سے کون سا کاروبار جائز ہے اور کون سا ناجائز ہے!

دیکھئے اس کا اصل منشا کیا ہے‘ اس کا فلسفہ کیا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ آپ چیزوں کی حقیقت کو جان لیں ☆ بعض چیزیں دیکھنے میں بہت خوشنما نظر آتی ہیں لیکن حقیقت میں وہ کچھ اور ہوتی ہیں۔ اس آڑھت کی حقیقت بھی سمجھ لیں —— اگر آپ کے پاس سرمایہ ہے تو باہر کا مال خرید لیجئے‘ دوکان میں رکھیے لوگ آپ سے خرید لیں گے‘ مگر اڈا بنا کر بیٹھ جانے میں تو خباثت پر خباثت ہوتی ہے۔ ہر آڑھتی ایک بینکر بن گیا ہے‘ وہ اپنے علاقے کے زمینداروں اور کاشت کاروں کو ایڈوانس دیتا ہے اور اس طرح ان کو پابند کرتا ہے کہ تمہارا مال میرے اڈے سے ہی جائے گا۔ گویا اس قرض کا ایک صلہ لے رہا ہے‘ اس شکل میں کہ وہ پابند ہو گیا ہے کہ

(۱) صحیح البخاری‘ کتاب الشروط‘ باب ما لا یجوز من الشروط فی النکاح۔ وصحیح مسلم‘ کتاب البیوع‘ باب تحریم بیع الحاضر للبادی۔

☆ بقول اقبال ؎

اے اہلِ نظر ذوقِ نظر خوب ہے لیکن  جو شے کی حقیقت کو نہ دیکھے وہ نظر کیا!  (مرتب)



مال اسی دوکان پر لائے گا اور کمیشن لازماً اسی آڑھتی کو ملے گا تو اب صرف آڑھت نہیں رہی بلکہ اس سے بڑھ کر اس میں بینکنگ شامل ہو گئی اس طرح اس میں ایک کے اوپر دوسرا سود کا ردّا چڑھتا چلا جائے گا۔

## مقصدِ خطاب: اسلامی معاشی فلسفے کی پہچان

میں اس وقت جو عرض کر رہا ہوں اس کا مقصد صرف اتنا ہے کہ اسلام کے فلسفے کو سمجھ لیا جائے۔ اسلام کا اصل نظام العمل تو قُلِ الْعَفْوَ والا نظام ہے جس سے اونچا کوئی سوشلزم دنیا میں ہوسکتا ہی نہیں‘ کسی انسانی تصور میں یہ آ سکتا ہی نہیں۔ یہ تو اسلام کی ایمانی‘ احسانی اور اخلاقی تعلیم ہے۔ دوسری طرف اسلام کا ایک معاشی نظام قانون اور فقہی سطح پر ہے‘ وہ ایک محدود (controlled) اور منضبط (managed) سرمایہ داری ہے۔ management والا حصہ زکوٰۃ اور عشر کا نظام ہے۔ اس میں ایک اور بات ذہن میں رکھیے جس پر ہمارے فقہاء کا اجماع ہے کہ اگر کسی وقت ایسی صورت حال پیدا ہو جائے کہ معاشرے کے فقراء کی ضروریات‘ زکوٰۃ اور عشر وغیرہ سے پوری نہ ہو رہی ہوں‘ شہریوں کی کفالت کی ذمہ داری پوری نہ ہو رہی ہو تو مالداروں سے زائد جبراً بھی لیا جا سکتا ہے۔ یہ نہیں ہے کہ بس اسی اڑھائی فیصد کی شرح پر ہاتھ بندھ گئے۔ وہ ایک نارمل شرح ہے لیکن اس سے زیادہ بھی لیا جا سکتا ہے۔ بہرحال وہ management جو اسلام نے اس وقت کی تھی‘ اس میں اسلام کی اخلاقی تعلیمات کا جو حصّہ (contribution) ہے اسے بھی ذہن میں رکھیے جس تک کہ اہل مغرب کی رسائی ابھی تک نہیں ہوئی۔ ان اخلاقی تعلیمات میں انسان کی غیرت وحمیّت اور اس کی مروّت کو اپیل کیا گیا ہے کہ یہ صدقات مت لو اور اس میں یہ ترغیب بھی ہے کہ کام کرو‘ محنت کرو۔ اس بارے میں نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: ((اَلْكَاسِبُ حَبِيْبُ اللّٰهِ)) یعنی جو بھی محنت کرے‘ کوشش کرے وہ اللہ کا ساتھی‘ اللہ کا دوست اور اللہ کا محبوب ہے۔

ہم نے اپنے سکول کے زمانے میں ایک بزرگ کے حوالے سے ایک حکایت پڑھی تھی جسے سن کر ہم بہت متاثر ہوئے کہ اس بزرگ نے بہت ہی عمدہ بات کہی۔ بعد میں معلوم ہوا کہ یہ کسی بزرگ کا نہیں بلکہ رسول اللہ ﷺ کا واقعہ ہے:

’’ایک انصاری شخص رسول اللہ ﷺ کے پاس سوال کرنے کی غرض سے آیا۔ آپ ﷺ نے اس سے پوچھا: کیا تیرے گھر میں کچھ ہے؟ وہ بولا کیوں نہیں‘ ایک کمبل ہے جس کا ایک حصہ ہم بچھا لیتے ہیں اور ایک حصّہ اوڑھ لیتے ہیں اور ایک پانی کا پیالہ ہے جس

سے ہم پانی پیتے ہیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا: وہ دونوں چیزیں میرے پاس لے آ' وہ گیا اور اپنی دونوں چیزیں لے آیا۔ آپ ﷺ نے ان دونوں کو ہاتھ میں لے کر فرمایا: ان کا خریدار کون ہے؟ ایک شخص بولا: میں ایک درہم میں خریدتا ہوں۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ایک درہم سے زائد کون دیتا ہے' آپ ﷺ نے دو یا تین مرتبہ فرمایا۔ ایک شخص نے کہا: میں ان دونوں چیزوں کو دو درہم میں لینے کے لیے تیار ہوں۔ آپ ﷺ نے وہ دونوں چیزیں اس کے حوالے کر دیں اور اس سے دو درہم لے کر اس انصاری شخص کو دے دیے اور فرمایا: ایک درہم کی کچھ کھانے پینے کی چیزیں لے کر گھر میں ڈال لے اور دوسرے سے ایک کلہاڑی خرید لے۔ وہ کلہاڑی لے کر آپ ﷺ کے پاس آیا۔ آپ ﷺ نے اس میں ایک لکڑی اپنے دست مبارک سے ٹھونکی اور فرمایا: جا لکڑیاں کاٹ اور بیچ اور پندرہ دن تک میں تجھے یہاں نہ دیکھوں۔ پس وہ شخص چلا گیا۔ وہ لکڑیاں کاٹتا اور بیچتا۔ کچھ دنوں میں اس نے دس درہم کما لیے جس میں سے اس نے کچھ کا کپڑا خریدا اور کچھ کھانے پینے کا سامان۔ آپ ﷺ نے (اس کی خوشحالی دیکھ کر) فرمایا: تیرے حق میں یہ بہتر ہے اس بات سے کہ قیامت کے دن تیرے منہ پر مانگنے کی وجہ سے ایک داغ لگا ہو۔ نیز آپ ﷺ نے فرمایا: سوال کرنا درست نہیں مگر تین طرح کے آدمیوں کے لیے' ایک وہ جو نہایت مفلس ہو خاک میں لوٹتا ہو۔ دوسرا وہ جو پریشان کن قرضوں کے بوجھ تلے دبا ہوا ہو اور تیسرا وہ جس کے پاس دیت میں دینے کے لیے کچھ نہ ہو''۔ (سنن ابی داؤد)

اب یہ اخلاقی تعلیم ہے۔ کفالتِ عامہ اور اجتماعی بہبود کے اندر اگر اخلاقیات کا یہ عنصر شامل نہ ہو تو اس ویلفیئر کا حشر بھی وہی ہوگا جو ان ممالک کے اندر ہو رہا ہے۔ اس میں بے ایمانیاں بھی ہو رہی ہیں' یعنی کام بھی کر رہے ہیں اور ویلفیئر بھی لے رہے ہیں۔ اس سے بڑھ کر جو کچھ ہمارے پاکستانی سویڈن اور ڈنمارک میں کر رہے ہیں وہ تو ڈوب مرنے کا مقام ہے۔ ان میں غیرت' شرافت اور حمیّت نام کی کوئی رمق باقی نہیں رہی۔ وہ بڑے عیش اور فخر سے خیرات پر جی رہے ہیں اور اسی وجہ سے ان ممالک میں چپکے ہوئے ہیں' وہاں سے نکل نہیں سکتے' حالانکہ خاندان برباد ہو رہے ہیں۔ اس حوالے سے میں صرف اتنا کہوں گا کہ آدمی جب کمینگی اور بے غیرتی کا عادی ہو جائے تو بفحوائے فرمانِ رسول ﷺ اس کے لیے موت زندگی سے بہتر ہے: ((فَبَطْنُ الْاَرْضِ خَيْرٌ لَّكُمْ مِنْ ظَهْرِهَا))[1] ''تب زمین کا پیٹ تمہارے لیے زمین کی پیٹھ سے بہتر ہے!''

(۱) سنن الترمذی' کتاب الفتن عن رسول اللہ ﷺ' باب ما جاء فی النهی عن سب الرياح۔



## معاشرے میں معاشی توازن کے لیے اسلام کی تدابیر

اسلام کے معاشی نظام میں ہر شہری کی بنیادی ضروریات کی کفالت اسلامی ریاست کے ذمے ہے اور اس کے لیے اس کے پاس زکوٰۃ اور عشر وغیرہ ذرائع ہیں۔ اس کے علاوہ انسان کو آزادی ہے کہ چاہے دکان سے کمائے' زمین سے کمائے' کارخانے سے کمائے' محنت کرے' کوشش کرے' البتہ آزادی کے ساتھ ساتھ یہ بھی شرط ہے کہ اس سرمائے کو زنجیر پہنا کر رکھو' سرمائے کا یہ جن ضرورت سے زیادہ نہ کھل کھیلے' ورنہ یہ آکاس بیل بن جائے گا اور پورے معاشرے کو تباہ کر کے رکھ دے گا۔ اس کے لیے اسلام نے مختلف تدابیر اختیار کی ہیں جن سے معاشرے میں ایک طرح کا توازن پیدا ہوتا ہے۔

(۱) جنسی محرکات پر پابندی: جنسی جذبہ انسان کی بہت بڑی کمزوری ہے اور یہ جذبہ انسان کے اندر سب سے طاقتور (potent) جذبۂ محرّکہ ہے۔ اسلام نے انسان کے اس جذبہ کو مشتعل (exploit) کر کے کمائی کرنے کو حرام مطلق قرار دیا ہے۔ چنانچہ ساری فلم انڈسٹری' قحبہ گری کا کاروبار اور فحش لٹریچر کی طباعت و اشاعت اور خرید و فروخت کا سارا دھندا اس اصول کے تحت حرام ہے۔

(۲) منشیات فروشی پر پابندی: اسی طرح انسان کی کمزوریوں کو مشتعل (exploit) کر کے کمائی کرنا بھی حرام ہے۔ چنانچہ شراب' ہیروئن اور دیگر منشیات کو کمائی کا ذریعہ بنانا حرام ہے۔

(۳) اسراف و تبذیر کی ممانعت: انسان اکثر و بیشتر تعیش کے لیے دولت کماتا ہے' لیکن اسلام نے عیاشی کے تمام دروازے بند کر دیے ہیں۔ قرآن مجید نے اسراف و تبذیر دونوں سے بچنے کا حکم دیا ہے۔ اسراف یہ ہے کہ آپ کے لیے کوئی شے ضروری ہے لیکن آپ نے اس پر ضرورت سے زیادہ خرچ کیا ہے۔ مثلاً غذا آپ کی ضرورت ہے' آپ کی ضرورت ایک سالن روٹی سے پوری ہو سکتی ہے لیکن آپ نے دس دس کھانے پکائے ہوئے ہیں' یہ اسراف ہے۔ تبذیر یہ ہے کہ بلا کسی ضرورت کے محض اپنی دولت کے مظاہرے کے لیے خرچ کرنا' جس طرح ہمارے ہاں شادیوں اور مختلف تقریبات میں ہوتا ہے۔ تبذیر کے بارے میں فرمایا گیا: ﴿اِنَّ الْمُبَذِّرِيْنَ كَانُوْٓا اِخْوَانَ الشَّيٰطِيْنِ ۭ﴾ (بنی اسراء یل:۲۷) ''بے شک دولت کی نمود و نمائش کرنے والے شیطانوں کے بھائی ہیں''۔ یہ مبذّرین شیطان کے بھائی کس طرح ہیں' اس کو نوٹ کیجیے۔ شیطان کا سب سے بڑا حربہ خمر اور میسر کے حوالے سے قرآن مجید میں بیان کیا گیا

ہے:﴿اِنَّمَا یُرِیْدُ الشَّیْطٰنُ اَنْ یُّوْقِعَ بَیْنَکُمُ الْعَدَاوَۃَ وَالْبَغْضَآءَ فِی الْخَمْرِ وَالْمَیْسِرِ﴾ (المائدۃ:۹۱) ’’شیطان یہ چاہتا ہے کہ شراب اور جوئے کے ذریعے سے تمہارے اندر باہمی دشمنی اور بغض پیدا کر دے‘‘۔ یہی کام تبذیر سے ہوتا ہے۔ فرض کیجیے ایک کروڑ پتی کی بیٹی کی شادی ہو رہی ہے اور ایکڑوں پر پھیلی ہوئی کوٹھی بقعہ نور بنی ہوئی ہے۔ ایک ایک پتے کے ساتھ بلب اور قمقمہ لگا ہوا ہے۔ اسی سیٹھ کا کوئی شوفر ہے‘ دربان ہے‘ چوکیدار ہے اور ہوسکتا ہے کہ اس کی بچی بوڑھی ہو رہی ہو اور اس کے ہاتھ پیلے نہ ہو سکتے ہوں‘ صرف اس بنا پر کہ بنیادی ضروری چیزیں بھی اس کے پاس نہیں ہیں۔ اس موقع پر اس کے احساسات کیا ہوں گے‘ اس کی کیفیت کیا ہوگی؟ کیا موقع ملنے پر وہ سیٹھ کا پیٹ نہیں پھاڑے گا؟ یہ ہے وہ بغض اور عداوت جس کی وجہ سے بلاوجہ دولت کی نمود و نمائش کرنے والے کو شیطان کا بھائی قرار دیا گیا ہے۔

اس حوالے سے ایک اسلامی ملک میں قانون سازی ہوسکتی ہے اور دولت کی نمود و نمائش پر پابندی عائد کی جاسکتی ہے۔ یہ بھی طے کیا جاسکتا ہے کہ اتنے رقبے سے زیادہ بڑا مکان کوئی نہیں بنا سکتا‘ وغیرہ وغیرہ۔ اب اگر یہ پابندیاں لگیں گی تو پھر آدمی دولت کیوں جمع کرے گا۔ یہ ساری چیزیں ہیں جو توازن اور اعتدال پیدا کرنے والی ہیں۔

## حرفِ آخر

میں نے اسلام کے معاشی و اقتصادی نظام کا بنیادی فلسفہ اپنی سمجھ کے مطابق آپ حضرات کے سامنے پیش کر دیا ہے۔ اسلامی معیشت کے بارے میں قرآن مجید نے صرف ایک اصول دیا ہے:﴿کَیْلَا یَکُوْنَ دُوْلَۃً بَیْنَ الْاَغْنِیَآءِ مِنْکُمْ﴾ ’’ایسا نہیں ہونا چاہیے کہ سرمایہ تمہارے اغنیاء ہی کے مابین گردش میں رہے‘‘۔ معاشرے میں سرمائے کی مساوی بنیادوں پر تقسیم (equal distribution) ہونی چاہیے تاکہ عوام کے درمیان معاشی ناہمواری ایک حد سے بڑھنے نہ پائے۔ یہ اسلام کے معاشی نظام کا فلسفہ اور حکمت ہے جو مجھے سمجھ آیا ہے۔ باقی جہاں تک اس کے اصول و مبادی اور باقی تفاصیل کا معاملہ ہے اور خاص طور پر جدید اقتصادی مسائل اور ان کی پیچیدگیاں ہیں‘ یہ واقعتاً ایسی چیزیں ہیں جن کے لیے معاشیات کے ماہرین کو محنت اور مشقت سے کام کرنا پڑے گا۔

اقول قولی ھذا واستغفر اللّٰہ لی ولکم ولسائر المسلمین والمسلمات○○

(مرتب: محمد زاہد‘ ادارتی معاون)



## بقیہ: عرضِ احوال

کیوں نہیں پڑھتے‘ وہ آوازیں جو ہماری فضاؤں میں گونج رہی ہیں انہیں کیوں سنائی نہیں دیتیں؟ انہوں نے عوام کی چیخ و پکار سے کان کیوں بند کر رکھے ہیں؟ شاید یہ بدنصیب قرآن کے اس فتویٰ کی زد میں آ چکے ہیں: ’’اللہ نے مہر لگا دی ہے ان کے دلوں پر اور ان کی سماعت پر‘ اور ان کی آنکھوں پر پردہ پڑ چکا ہے‘ اور ان کے لیے ہے بڑا عذاب۔‘‘

قارئین کرام! نو سال پہلے ہم نے اپنی تاریخ کا مکروہ ترین اور انتہائی احمقانہ فیصلہ کیا اور اس کج روی نے ہمیں تباہی کے کنارے پر پہنچا دیا ہے۔ آج ہم ایک بار پھر ایک فیصلہ کن موڑ پر کھڑے ہیں‘ امریکہ ہماری سلامتی پر فیصلہ کن ضرب لگانا چاہتا ہے‘ وہ لالچ دے کر اور دھونس و دھاندلی سے ہمیں شمالی وزیرستان پر حملہ کرنے پر مجبور کر رہا ہے۔ بعض اطلاعات کے مطابق مقتدر حلقوں میں ایک بڑا گروہ امریکہ کی شر انگیزی اور فتنہ پردازی سے تنگ آ چکا ہے‘ وہ اپنوں کا مزید خون بہتا نہیں دیکھنا چاہتا‘ لہٰذا امریکہ کے سامنے ڈٹ جانا چاہتا ہے۔ عوام کی اکثریت تو پہلے ہی امریکہ سے شدید نفرت کرتی ہے۔ اندیشہ صرف اس مفاد پرست اور قوم فروش طبقہ سے ہے جسے صرف اقتدار اور دولت سے غرض ہے‘ جو سوئس بینکوں میں دولت سینت سینت کر رکھ رہا ہے‘ جس کے بچے یورپ اور امریکہ میں پڑھ رہے ہیں۔ اگر ہماری مقتدر قوتیں اس ملک و ملت کے دشمن طبقہ کے دباؤ میں آ کر شمالی وزیرستان پر حملہ کر دیتی ہیں تو پاکستان کو اپنی جغرافیائی سلامتی برقرار رکھنا انتہائی مشکل ہو جائے گا۔ آخر میں ہم اس ملت فروش اور دین دشمن طبقہ سے صاف صاف کہے دیتے ہیں کہ تاریخ پر نگاہ ڈالو‘ قوم فروشوں اور وطن کے غداروں کے ساتھ کیا سلوک ہوا۔ اپنوں نے ان سے نفرت کی‘ بدترین نفرت‘ زہر آلود نفرت —— اور جن کی خاطر یہ ذلت و رسوائی مول لی تھی انہوں نے یہ کہہ کر انہیں تہ تیغ کر دیا کہ تم اپنوں کے نہیں بنے تو ہمارے کہاں بنو گے؟ **فَاعْتَبِرُوْا یٰٓاُولِی الْاَبْصَارِ!**

پاکستان کے تمام سیاست دانوں‘ وکیلوں‘ تاجروں‘ مزدوروں‘ کسانوں‘ صنعت کاروں‘ محنت کشوں‘ سرکاری اور غیر سرکاری ملازموں یعنی عوام کے ہر طبقہ کا قومی اور دینی فریضہ ہے کہ وہ حکومت کو شمالی وزیرستان پر حملہ کرنے سے باز رکھنے کی بھرپور جدوجہد کریں۔ اگر پھر بھی حکومت حملے کا احمقانہ اور تباہ کن فیصلہ کر لے تو وہ حکومت کے راستے کی دیوار بن جائیں‘ وگرنہ مملکت خداداد پاکستان کی تباہی و بربادی میں سب شریک سمجھے جائیں گے۔ **وما علینا الا البلاغ!**

❁❁❁

# شیطان اور اس کی چالیں

## قرآن کریم کی روشنی میں

عتیق الرحمٰن صدیقی

### لغوی مفہوم

''شَیطان'' عربی زبان کا لفظ ہے' اس میں نون اصلی ہے اور یہ شَطَن سے مشتق ہے جس کے معنی دور ہونے کے ہیں' بِئرٌ شَطُونٌ کے معنی بہت گہرے کنوئیں کے ہوتے ہیں۔ بعض نے کہا ہے کہ لفظ شیطان میں نون زائدہ ہے اور یہ شَاطَ یَشِیْطُ سے مشتق ہے جس کے معنی غصہ سے سوختہ ہو جانے کے ہیں اور شیطان کو بھی شیطان اس لیے کہا گیا ہے کہ وہ آگ سے پیدا ہوا ہے' جیسا کہ آیت ﴿وَخَلَقَ الْجَآنَّ مِنْ مَّارِجٍ مِّنْ نَّارٍ ﴿۱۵﴾﴾ (الرحمٰن) ''اور جنّات کو آگ کے شعلے سے پیدا کیا'' سے معلوم ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس میں قوتِ غضبیہ اور حمیّتِ مذمومہ افراط کے ساتھ پائی جاتی ہے اور اس بنا پر اس نے حضرت آدمؑ کے سامنے سجدہ کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ ابوعبیدہ نے کہا ہے کہ شیطان ہر سرکش کو کہتے ہیں خواہ وہ جنّ و اِنس میں سے ہو یا دیگر حیوانات میں سے۔ قرآن میں ہے: ﴿شَیٰطِیْنَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ﴾ (الانعام:۱۱۲) ''شیطان (سیرت) انسانوں کو اور جنّوں کو''۔ (مفردات القرآن)

صاحبِ تفہیم القرآن ﴿وَاِذَا خَلَوْا اِلٰی شَیٰطِیْنِهِمْ﴾ (البقرۃ:۱٤) کے ضمن میں رقم طراز ہیں کہ:

> ''شیطان عربی زبان میں سرکش' متمرّد اور شوریدہ سر کو کہتے ہیں' انسان اور جن دونوں کے لیے یہ لفظ مستعمل ہوتا ہے۔ اگرچہ قرآن میں یہ لفظ زیادہ تر شیاطین جن کے لیے آیا ہے' لیکن بعض مقامات پر شیطان صفت انسانوں کے لیے بھی استعمال کیا گیا ہے اور سیاق وسباق سے بآسانی معلوم ہو جاتا ہے کہ کہاں شیطان سے انسان مراد ہیں اور کہاں جن۔'' (تفہیم القرآن' جلد اول)



### شیطان اور ابلیس

الشَّیطان کو ابلیس بھی کہا جاتا ہے۔ الإبلاس (افعال) کے معنی سخت ناامیدی کے باعث غمگین ہونے کے ہیں۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ اسی سے ابلیس مشتق ہے۔ قرآن میں ہے: ﴿وَیَوْمَ تَقُوْمُ السَّاعَةُ یُبْلِسُ الْمُجْرِمُوْنَ ﴿۱۲﴾﴾ (الروم) ''اور جس دن قیامت برپا ہوگی گنہگار مایوس و مغموم ہو جائیں گے''۔ مختصراً ابلیس کا لفظی ترجمہ ہے ''انتہائی مایوس''۔ اصطلاحاً اس سے وہ جن مراد ہے جس نے اللہ کے حکم کی نافرمانی کی' آدم اور بنی آدم کے لیے مطیع و مسخر ہونے سے انکار کر دیا اور اللہ سے قیامت تک کے لیے مہلت اور نسل انسانی کو گمراہ کرنے اور بہکانے کا موقع طلب کیا۔ یہ امر ذہن نشین رہنا چاہیے کہ شیطان اور ابلیس محض کسی مجرد قوت کا نام نہیں بلکہ وہ انسان کی طرح ایک صاحبِ تشخّص ہستی ہے۔ وہ فرشتہ نہیں بلکہ جنّوں میں سے تھا۔ اللہ کے حکم سے بغاوت کرنے میں وہ پیش پیش تھا۔ جنّوں کی جماعت کا سرغنہ ہونے کی بنا پر غرور اور تکبّر سے اس نے سرکشی کا یہ رویّہ اپنایا تھا۔ اسے ہرگز گوارا نہ تھا کہ آدمؑ کو علوِّ مرتبت سے اتنا نواز دیا جائے کہ وہ فردوسِ بریں کا پاسباں بن جائے۔

### شیطان کی سرکشی اور بغاوت

اللہ تعالیٰ نے فرشتوں سے کہا کہ حضرت آدم کو سجدہ کرو' اللہ کے حکم کی تعمیل میں سب سربسجود ہو گئے' مگر شیطان اکڑ گیا اور اس نے غرور کا اظہار کیا' جب اس سے پوچھا گیا کہ تیری اس سرکشی کا محرک کیا ہے؟

﴿قَالَ مَا مَنَعَكَ اَلَّا تَسْجُدَ اِذْ اَمَرْتُكَ ؕ قَالَ اَنَا خَیْرٌ مِّنْهُ ۚ خَلَقْتَنِیْ مِنْ نَّارٍ وَّخَلَقْتَهٗ مِنْ طِیْنٍ ﴿۱۲﴾﴾ (الاعراف)

> ''پوچھا تجھے کس چیز نے سجدہ کرنے سے روکا جبکہ میں نے تجھ کو حکم دیا تھا؟ بولا: میں اس سے بہتر ہوں' تو نے مجھے آگ سے پیدا کیا ہے اور اسے مٹی سے۔''

شیطان نے عزت و برتری کا ایک جھوٹا تصور اپنے ذہن میں قائم کیا اور یہ سمجھا کہ وہ بزرگی اور عزت کے منصب پر فائز ہے۔ اس جھوٹے پندار اور عزت کے بے بنیاد اِدّعا نے اسے راندۂ درگاہ بنا دیا اور وہ ذلیل اور پست ہو کر رہ گیا۔ اس کے مادۂ تخلیق اور نسلی تفاخر نے اس سے اہانت کا ارتکاب کرایا اور اللہ کو چیلنج کیا کہ وہ ثابت کرے گا کہ انسان جس فضیلت سے مشرّف کیا گیا ہے وہ ہرگز اس کا استحقاق نہیں رکھتا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿اِنَّ عِبَادِیْ لَیْسَ لَكَ

عَلَيْهِمْ سُلْطٰنٌ﴾ یعنی میرے بندوں پر تجھے اقتدار نہ ہوگا' تو بہروپ بھر کر جو معجز نمائی بھی دکھائے گا' میرے بندے تیرے جھانسے میں ہرگز نہیں آئیں گے' تیرے تمام تر حربے اور ہتھکنڈے اکارت جائیں گے۔

## شیطان' انسان کا ازلی دشمن

شیطان انسان کا ازلی دشمن ہے' اس نے برملا اعلان کیا کہ وہ انسان کو شر اور بدی کی راہ پر لانے کے لیے اپنی تمام تر قوتوں اور صلاحیتوں کو بروئے کار لائے گا۔ قرآن حکیم اس کے کھلا دشمن ہونے کا اعلان کرتا ہے:

﴿يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ كُلُوْا مِمَّا فِي الْاَرْضِ حَلٰلًا طَيِّبًا ۡ وَّلَا تَتَّبِعُوْا خُطُوٰتِ الشَّيْطٰنِ ۭ اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ ۝۱۶۸ اِنَّمَا يَاْمُرُكُمْ بِالسُّوْۗءِ وَالْفَحْشَاۗءِ وَاَنْ تَقُوْلُوْا عَلَي اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ۝۱۶۹﴾ (البقرۃ)

''لوگو! زمین میں جو حلال اور پاک چیزیں ہیں انہیں کھاؤ اور شیطان کے بتائے ہوئے راستوں پر مت چلو' یقیناً وہ تمہارا کھلا دشمن ہے۔ وہ تو تمہیں بدی اور فحش ہی کا حکم دیتا ہے اور (یہ سکھاتا ہے کہ) تم اللہ کے نام پر وہ باتیں کہو جن کے متعلق تمہیں علم نہیں ہے (کہ وہ اللہ نے فرمائی ہیں یا نہیں)۔''

گویا شیطان برائی و بے حیائی کا داعی ہے۔ اس کا وطیرہ یہ ہے کہ وہ اِسراف و تبذیر کی روش کو مستحکم کرنے پر پورا زور صرف کرتا ہے مگر اللہ کی راہ میں کچھ خرچ کرنے پر سدِّراہ بن جاتا ہے اور ناداری' غربت اور افلاس کا شکار ہونے کا خوف دلاتا ہے:

﴿اَلشَّيْطٰنُ يَعِدُكُمُ الْفَقْرَ وَيَاْمُرُكُمْ بِالْفَحْشَاۗءِ ۭ وَاللّٰهُ يَعِدُكُمْ مَّغْفِرَةً مِّنْهُ وَفَضْلًا ۭ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ۝۲۶۸﴾ (البقرۃ)

''شیطان تمہیں مفلسی سے ڈراتا ہے اور شرمناک طرزِ عمل اختیار کرنے کی ترغیب دیتا ہے' مگر اللہ تمہیں اپنی بخشش اور فضل کی امید دلاتا ہے۔ اللہ بڑا فراخ دست اور دانا ہے۔''

## شیطان کی کارستانیاں

دینِ حق سے گہرا اخلاص رکھنے والوں سے بھی بعض اوقات کوئی چھوٹا یا بڑا گناہ سرزد ہو جاتا ہے۔ گناہ کی نحوست سے شیطان کو یہ موقع میسّر آ جاتا ہے کہ وہ مخلصین کو دوسری غلطیوں اور لغزشوں کی طرف آمادہ کرے' ان میں بزدلی اور گھبراہٹ پیدا کرے اور عزیمت و



استقامت اور تہوّر و مردانگی میں ضعف پیدا کرے۔ غزوۂ اُحد میں بھی شیطان نے مؤمنوں کو بہکا کر ان کے قدم ڈگمگا دیے' قرآن نے شیطان کے اس بہکاوے پر یوں روشنی ڈالی:

﴿اِنَّ الَّذِيْنَ تَوَلَّوْا مِنْكُمْ يَوْمَ الْتَقَى الْجَمْعٰنِ ۙ اِنَّمَا اسْتَزَلَّهُمُ الشَّيْطٰنُ بِبَعْضِ مَا كَسَبُوْا ۚ وَلَقَدْ عَفَا اللّٰهُ عَنْهُمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ حَلِيْمٌ ۝۱۵۵﴾ (آل عمران)

''تم میں سے جو لوگ مقابلہ کے دن پیٹھ پھیر گئے تھے ان کی اس لغزش کا سبب یہ تھا کہ ان کی بعض کمزوریوں کی وجہ سے شیطان نے ان کے قدم ڈگمگا دیے تھے۔ اللہ نے انہیں معاف کر دیا۔ اللہ بہت درگزر کرنے والا بردبار ہے۔''

دوسرے مقام پر اسی مضمون کو یوں بیان کیا:

﴿اِنَّمَا ذٰلِكُمُ الشَّيْطٰنُ يُخَوِّفُ اَوْلِيَاۗءَهٗ ۠ فَلَا تَخَافُوْهُمْ وَخَافُوْنِ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ۝۱۷۵﴾ (آل عمران)

''اب تمہیں معلوم ہو گیا ہے کہ وہ دراصل شیطان تھا اپنے دوستوں سے خواہ مخواہ ڈرا رہا تھا' لہٰذا آئندہ تم انسانوں سے نہ ڈرنا مجھ سے ڈرنا' اگر تم حقیقتاً صاحب ایمان ہو۔''

## شیطان کے حربے اور ہتھکنڈے

شیطان انسان کو ذمائمِ اخلاق کی طرف راغب کرنے کے لیے ہر ایسا حربہ اختیار کرتا ہے جو خوشنما بھی ہو اور دلربا بھی اور ایسی زیب و زینت سے آراستہ اور مزین ہو کہ انسان اس پر لٹو ہو جائے اور وہ اعمالِ بد میں گرفتار ہو جائے۔ ایسے میں شیطان اسے اطمینان دلاتا ہے کہ تم جو کچھ کر رہے ہو خوب کر رہے ہو' وہ انہیں وعدوں اور اُمیدوں میں الجھاتا ہے اور اس طرح انسان کو لطف و لذت سے مسحور کر کے غلط راہوں پر گامزن کر دیتا ہے۔ اس کی فریب کاری کے انداز جُدا جُدا ہیں' وہ انسان کی کمزوری کی مناسبت سے اپنے دامِ تزویر میں اسے پھانس لیتا ہے۔ قرآن کہتا کہ اس کے سارے وعدے بجز فریب کے اور کچھ نہیں: ﴿يَعِدُهُمْ وَيُمَنِّيْهِمْ ۭ وَمَا يَعِدُهُمُ الشَّيْطٰنُ اِلَّا غُرُوْرًا ۝۱۲۰﴾ (النساء)

وہ ان کاموں جو اللہ کے ہاں ناپسندیدہ اور مبغوض ہیں اور جن کی حرمت کا قطعی ذکر کتاب حکیم میں موجود ہے اور بعض صحت انسانی کے لیے سمِ قاتل کی حیثیت رکھتے ہیں' کو جاذب اور دلکش بنا کر پیش کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ ایمان والوں سے مخاطب ہو کر فرماتا ہے:

﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنَّمَا الْخَمْرُ وَالْمَيْسِرُ وَالْاَنْصَابُ وَالْاَزْلَامُ رِجْسٌ

مِّنْ عَمَلِ الشَّيْطٰنِ فَاجْتَنِبُوْهُ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ﴿۹۰﴾ (المائدۃ)

''اے لوگو جو ایمان لائے ہو' یہ شراب اور جوا' یہ آستانے اور پانسے سب گندے شیطانی کام ہیں ان سے پرہیز کرو' اُمید ہے کہ تمہیں فلاح نصیب ہوگی۔''

وہ انسانوں کے مابین دوریاں' بیگانگیاں اور دشمنیاں پیدا کرتا ہے اور بغض و عداوت کو بڑھاوا دیتا ہے اور اپنے چیلوں چانٹوں کے ذریعے اس کے نشو و ارتقاء میں اضافہ کرتا ہے:

﴿اِنَّمَا يُرِيْدُ الشَّيْطٰنُ اَنْ يُّوْقِعَ بَيْنَكُمُ الْعَدَاوَةَ وَالْبَغْضَآءَ فِي الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ وَيَصُدَّكُمْ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ وَعَنِ الصَّلٰوةِ ۚ فَهَلْ اَنْتُمْ مُّنْتَهُوْنَ﴿۹۱﴾﴾ (المائدۃ)

''شیطان تو یہ چاہتا ہے کہ شراب اور جوئے کے ذریعے سے تمہارے درمیان عداوت اور بغض ڈال دے اور تمہیں نماز سے روک دے۔ پھر کیا تم ان چیزوں سے باز رہو گے؟''

شیطان کے مفسدانہ اور تخریب کارانہ طرزِ عمل کی وجہ سے قرآن نے بندوں کو اس سے دور رہنے کا مشورہ دیا اور اس کی رفاقت کو نہایت بری رفاقت قرار دیا: ﴿وَمَنْ يَّكُنِ الشَّيْطٰنُ لَهٗ قَرِيْنًا فَسَآءَ قَرِيْنًا﴿۳۸﴾﴾ (النساء) ''سچ یہ ہے کہ شیطان جس کا رفیق ہوا' اسے بہت ہی بری رفاقت میسّر آئی۔''

شیطان کی دشمنی کی اللہ تعالیٰ واضح طور پر شہادت دیتا ہے اور بتاتا ہے کہ وہ ہر نبی کے مدّمقابل آیا اور اس نے ہر نبی کی مخالفت و مخاصمت میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی:

﴿وَكَذٰلِكَ جَعَلْنَا لِكُلِّ نَبِيٍّ عَدُوًّا شَيٰطِيْنَ الْاِنْسِ وَالْجِنِّ يُوْحِيْ بَعْضُهُمْ اِلٰى بَعْضٍ زُخْرُفَ الْقَوْلِ غُرُوْرًا ؕ﴾ (الانعام:۱۱۲)

''اور ہم نے تو اس طرح ہمیشہ شیطان انسانوں اور شیطان جنوں کو ہر نبی کا دشمن بنایا ہے جو ایک دوسرے پر خوش آئند باتیں دھوکے اور فریب کے طور پر القا کرتے ہیں۔''

## شیطان کا انبیاء علیہم السلام کی تمناؤں میں خلل انداز ہونا

شیطان انبیاء کرام علیہم السلام کی تمناؤں میں بھی خلل انداز ہوتا رہا ہے اور طرح طرح کے رخنے ڈالتا رہا ہے۔ انبیاء کرام علیہم السلام تو صرف یہ چاہتے تھے کہ دین حق کا بول بالا ہو اور لوگ سلامتی کے راستے پر چل کر دنیا بھی سنواریں اور عاقبت بھی۔ اس طرح وہ اپنے مقدّس مشن کا فروغ چاہتے اور اس امر کے طلب گار ہوتے کہ ان کی مساعی برآور ہوں' جبکہ شیطان شکوک و شبہات اور اعتراضات کا ایک انبار کھڑا کر دیتا' مگر اللہ تعالیٰ انبیاء کے پختہ اور اٹل وعدوں کو سچ



کر دکھاتا اور الجھنوں کو سلجھا دیتا۔ از روئے الفاظِ قرآنی:

﴿وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُوْلٍ وَّلَا نَبِيٍّ اِلَّآ اِذَا تَمَنّٰٓى اَلْقَى الشَّيْطٰنُ فِيْٓ اُمْنِيَّتِهٖ ۚ فَيَنْسَخُ اللّٰهُ مَا يُلْقِي الشَّيْطٰنُ ثُمَّ يُحْكِمُ اللّٰهُ اٰيٰتِهٖ ؕ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ﴿۵۲﴾﴾ (الحج)

''اور (اے نبی ﷺ) تم سے پہلے ہم نے نہ کوئی رسول ایسا بھیجا ہے نہ نبی (جس کے ساتھ یہ معاملہ پیش نہ آیا ہو) کہ جب اس نے تمنّا کی' شیطان اس کی تمنا میں خلل انداز ہو گیا۔ پس اللہ شیطان کی خلل اندازیاں مٹا دیتا ہے اور اپنی آیات کو پختہ کر دیتا ہے۔ اللہ حکیم اور علیم ہے۔''

قرآن نے یہ بھی واضح کیا ہے کہ شیطان کی پیروی کرنے والوں کا کردار کمزور' بودا اور گھناؤنا ہوتا ہے۔ اہلِ ایمان کا کام یہ ہے کہ وہ چشمِ بینا سے کام لیں اور ایمانی بصیرت کا مظاہرہ کرتے ہوئے ان کے جھانسے میں نہ آئیں۔ فرمایا:

﴿هَلْ اُنَبِّئُكُمْ عَلٰى مَنْ تَنَزَّلُ الشَّيٰطِيْنُ﴿۲۲۱﴾ تَنَزَّلُ عَلٰى كُلِّ اَفَّاكٍ اَثِيْمٍ﴿۲۲۲﴾ يُّلْقُوْنَ السَّمْعَ وَاَكْثَرُهُمْ كٰذِبُوْنَ﴿۲۲۳﴾﴾ (الشعراء)

''لوگو! کیا میں تمہیں بتاؤں کہ شیاطین کس پر اترتے ہیں؟ ہر جعل ساز' بدکار پر اترتے ہیں؟ سنی سنائی باتیں کانوں میں پھونکتے ہیں اور ان میں سے اکثر جھوٹے ہوتے ہیں۔''

سید مودودیؒ اس آیۂ کریمہ کے ذیل میں لکھتے ہیں کہ:

''مراد ہیں کاہن' جوتشی' فال گیر' رمال اور عامل قسم کے لوگ جو غیب دانی کا ڈھونگ رچاتے پھرتے ہیں' گول مول لچھے دار باتیں بنا کر لوگوں کی قسمتیں بتاتے ہیں یا سیانے بن کر جنوں اور روحوں اور موکلوں کے ذریعے لوگوں کی بگڑی بنانے کا کاروبار کرتے ہیں۔'' (تفہیم القرآن' جلد سوم)

## آدمؑ سے شیطان کا انتقام

حضرت آدم علیہ السلام کے حسد نے شیطان کو حواس باختہ اور گستاخ کر دیا۔ آدم کی عزت و تکریم پر وہ جل بھن گیا اور پھر اس کی اکڑفوں نے اسے ذلیل و رسوا کر کے رکھ دیا اور وہ جنت سے نکال دیا گیا۔ اب اس نے انتقاماً یہ عزم کر لیا اور اس کا اعلان بھی کیا کہ وہ آدم کو مکر و فریب کے شکنجے میں کسے گا' شکوک و شبہات اور اوہام میں مبتلا کرنے میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کرے گا' وہ ثابت کرے گا کہ انسان ناسپاس اور احسان ناشناس ہے۔ حضرت آدم و حوا جنت

کے مکین ہو گئے' جنت کے لطف و سرور اور نکہت و نور سے سرشار ہو گئے' شیطان انہیں بہلانے' پھسلانے اور ناز و نعمت سے محروم کرنے کے لیے سرگرم عمل ہو گیا۔ خوشنما لبادے میں ملبوس ہو کر آدم و حوا کا ہمدرد اور خیر خواہ بن کر حیاتِ جاوداں سے ہمکنار کرنے کا جھانسہ دے کر انہیں اپنے ڈھب پر لے آیا۔ انہوں نے اس درخت کا مزا تو چکھا جس کے چکھنے سے ان کو روکا گیا تھا مگر اس کے نتیجے میں ان کے ستر کا نظام درہم برہم ہو گیا۔ دونوں بول اٹھے کہ انہوں نے اپنے اوپر بڑا ستم کیا' اب اللہ نے ان پر رحم نہ کیا تو وہ تباہ ہو جائیں گے۔ اب دونوں کی آنکھوں سے آنسو رواں تھے' ندامت سے آہ و بکا کر رہے تھے' آہ و فغاں اور سوز و گداز سے ان کے دل پھٹے جا رہے تھے۔

﴿فَتَلَقّٰٓى اٰدَمُ مِنْ رَّبِّهٖ كَلِمٰتٍ فَتَابَ عَلَيْهِ ؕ اِنَّهٗ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ ۝۳۷ قُلْنَا اهْبِطُوْا مِنْهَا جَمِيْعًا ۚ فَاِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ مِّنِّيْ هُدًى فَمَنْ تَبِعَ هُدَايَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ۝۳۸﴾ (البقرۃ)

''پھر سیکھ لیے آدم نے اپنے رب سے چند کلمے تو اللہ نے ان کی توبہ قبول کی' بے شک وہی ہے بہت توبہ قبول کرنے والا' نہایت رحم فرمانے والا۔ ہم نے حکم دیا اتر جاؤ اس جنت سے سب کے سب' پھر اگر آئے تمہارے پاس میری طرف سے (پیغام) ہدایت' تو جس نے پیروی کی میری ہدایت کی انہیں نہ تو کوئی خوف ہو گا اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔''

## شیطان کی چالیں

شیطان مکر و فریب' ریا اور دغا کے تانے بانے بننے میں محو رہتا ہے اور ایسی چالیں چلتا ہے کہ انسان دامِ ہمرنگِ زمیں میں پھنس جاتا ہے۔ اس نے اپنے معتوب' مغضوب اور مقہور ہونے کی پروا نہ کی' کبر و غرور میں آداب و تکریمات کی تمام حدود پھلانگ گیا۔ اس نے انسان کے اندر شرم و حیا کے فطری جذبہ پر وار کیا اور آدم و حوا کے ستر ایک دوسرے کے سامنے کھول دیے۔ یوں اس نے پہلا کام یہ کیا کہ برہنگی کے راستے سے فواحش کا دروازہ کھول دیا اور انسانوں کو جنسی بے راہ روی کا شکار کر دیا۔ وہ مختلف بہروپ بھرتا ہے اور خیر خواہ کے روپ میں جلوہ نما ہوتا ہے۔ وہ خوب سمجھتا ہے کہ انسان شر کی کھلی دعوت کو قبول نہیں کرتا' چنانچہ شیطان انسان پر حملہ آور ہونے کے لیے مختلف حیلے اختیار کرتا ہے اور اس کے برے کرتوتوں کو خوشنما بنا کر دکھاتا ہے۔ سورۃ النحل میں فرمایا گیا:

﴿تَاللّٰهِ لَقَدْ اَرْسَلْنَآ اِلٰٓى اُمَمٍ مِّنْ قَبْلِكَ فَزَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطٰنُ اَعْمَالَهُمْ فَهُوَ



وَلِيُّهُمُ الْيَوْمَ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۝۶۳﴾

''خدا کی قسم (اے محمد ﷺ) آپ سے پہلے بھی بہت سی قوموں میں ہم رسول بھیج چکے ہیں (اور پہلے بھی یہی ہوتا رہا ہے کہ) شیطان نے ان کے برے کرتوت انہیں خوشنما بنا کر دکھائے (اور رسولوں کی بات انہوں نے نہ مانی)' وہی شیطان آج ان لوگوں کا سرپرست بنا ہوا ہے اور یہ دردناک سزا کے مستحق بن رہے ہیں۔''

قرآن دوسرے مقام پر کہتا ہے: ﴿وَمَا يَعِدُهُمُ الشَّيْطٰنُ اِلَّا غُرُوْرًا ۝۶۴﴾ (بنی اسراء یل)

''اور شیطان کے وعدے ایک دھوکے کے سوا اور کچھ بھی نہیں۔''

## ایک مثال: صاحب علم کا بھٹکنا

قرآن حکیم نے سورۃ الاعراف میں ایک معین شخص کا ذکر کیا ہے جو آیاتِ الٰہی کا علم رکھتا تھا۔ اس علم کے نتیجے میں اس کا طرزِ عمل سنورا اور نکھرا ہوا ہونا چاہیے تھا تاکہ اللہ اسے بلند مراتب پر فائز کرتا' مگر وہ دنیا کے فائدوں' لذتوں اور آرائشوں کی طرف مائل ہو کر رہ گیا' پھر شیطان اس کے پیچھے پڑ گیا اور وہ بھٹکنے والوں میں شامل ہو کر رہا:

﴿وَاتْلُ عَلَيْهِمْ نَبَاَ الَّذِيْٓ اٰتَيْنٰهُ اٰيٰتِنَا فَانْسَلَخَ مِنْهَا فَاَتْبَعَهُ الشَّيْطٰنُ فَكَانَ مِنَ الْغٰوِيْنَ ۝۱۷۵ وَلَوْ شِئْنَا لَرَفَعْنٰهُ بِهَا وَلٰكِنَّهٗٓ اَخْلَدَ اِلَى الْاَرْضِ وَاتَّبَعَ هَوٰىهُ ۚ فَمَثَلُهٗ كَمَثَلِ الْكَلْبِ ۚ اِنْ تَحْمِلْ عَلَيْهِ يَلْهَثْ اَوْ تَتْرُكْهُ يَلْهَثْ ؕ﴾ (الاعراف:۱۷۶)

''اور (اے محمد ﷺ!) ان کے سامنے اس شخص کا حال بیان کرو جس کو ہم نے اپنی آیات کا علم عطا کیا تھا مگر وہ ان کی پابندی سے نکل بھاگا۔ آخر کار شیطان اس کے پیچھے پڑ گیا یہاں تک کہ وہ بھٹکنے والوں میں شامل ہو کر رہا۔ اگر ہم چاہتے تو اسے ان آیتوں کے ذریعے سے بلندی عطا کرتے مگر وہ تو زمین ہی کی طرف جھک کر رہ گیا اور اپنی خواہش نفس ہی کے پیچھے پڑا رہا' لہٰذا اس کی حالت کُتّے کی سی ہو گئی کہ تم اس پر حملہ کرو تب بھی زبان لٹکائے رہے اور اسے چھوڑ دو تب بھی زبان لٹکائے رہے۔''

## حق و باطل کے مابین آویزش اور شیطان کی چال

حق و باطل کے مابین رزم و پیکار اور آویزش میں داعی حق کا اثر انگیز ہتھیار عفو و درگزر' بردباری' متانت و شرافت اور میانہ روی ہے۔ وہ حالات کی نامساعدت میں صبر و استقامت سے کام لیتا ہے' باطل کے داؤ پیچ اسے اپنے ڈھب پر لانے میں ناکام رہتے ہیں۔ متنوع قسم کی

رذالتیں اسے مشتعل اور سیخ پا نہیں کرتیں‘ وہ شائستگی اور راست روی کی راہ سے ہٹتا نہیں اور نہ شیطان کی راہ کو اپناتا ہے۔ شیطان کو مؤمن کے اس طرزِ عمل پر خاصی تکلیف اور تشویش ہوتی ہے۔ وہ مؤمن کو غصہ دلانے‘ آپے سے باہر کرنے اور اُکسانے میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھتا۔ وہ دردمندی‘ خیر خواہی اور دوستی کا لبادہ اوڑھ کر اقامتِ دین کے داعی کو نہایت گھٹیا اور کمینہ حرکات کی جانب راغب کرتا ہے تاکہ خیر کا داعی بلندیٔ کردار اور رفعتِ اوصاف کا مقام کھو بیٹھے۔ اس طرح اس کے اور شریر النفس آدمی کے درمیان فرق مٹ جائے اور وہ ایک ہی سطح پر یکساں دکھائی دیں‘ مگر مؤمن مؤمنانہ بصیرت سے ان آلودگیوں اور خرابیوں کو بھانپ لیتا ہے۔ جب ایسی اکساہٹ کا غلبہ ہونے لگے تو وہ اپنے رب کی پناہ طلب کرتا ہے۔ یہ بات سورۃ الاعراف میں بھی بیان کی گئی ہے اور حٰمٓ السجدۃ میں بھی‘ فرمایا:

﴿وَاِمَّا یَنْزَغَنَّكَ مِنَ الشَّیْطٰنِ نَزْغٌ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ ؕ اِنَّهٗ هُوَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ ﴿۳۶﴾﴾ (حٰمٓ السجدۃ)

’’اور اگر تم شیطان کی طرف سے کوئی اکساہٹ محسوس کرو تو اللہ کی پناہ مانگ لو‘ وہ سب کچھ سنتا اور جانتا ہے۔‘‘

اللہ سے پناہ مانگنے کی تلقین سورۃ الناس میں بایں الفاظ کی گئی:

﴿مِنْ شَرِّ الْوَسْوَاسِ ۙ الْخَنَّاسِ ﴿۴﴾ الَّذِیْ یُوَسْوِسُ فِیْ صُدُوْرِ النَّاسِ ﴿۵﴾ مِنَ الْجِنَّةِ وَالنَّاسِ ﴿۶﴾﴾

’’(میں پناہ میں آتا ہوں اللہ کی) اُس وسوسہ ڈالنے والے کے شر سے جو بار بار پلٹ کر آتا ہے۔ جو لوگوں کے دلوں میں وسوسے ڈالتا ہے‘ خواہ وہ جنّوں میں سے ہو یا انسانوں میں سے۔‘‘

جو لوگ شیطان کے حربے اور چنگل سے بچ نکلیں ان کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿وَمَا یُلَقّٰىهَاۤ اِلَّا ذُوْ حَظٍّ عَظِیْمٍ ﴿۳۵﴾﴾ (حٰمٓ السجدۃ)

’’یہ چیز بڑے نصیبے والے کے سوا کسی کو حاصل نہیں ہوتی۔‘‘

معاشرے میں قتل و غارت اور کشت و خون‘ عیاری‘ مکاری اور فریب کاری‘ انصاف کی پامالی‘ عریانی‘ بے حیائی اور بدکاری کی عفونتیں‘ انتشار و خلفشار اور فساد و بگاڑ کی متنوع صورتیں‘ حقوق سے اغماض‘ فرائض سے پہلوتہی اور زندگی کے حقیقی مقصد سے روگردانی‘ تغافل اور سیم و



زر کی حرص و ہوس اور سیہ کارانہ طرزِ عمل شیطان کی اکساہٹوں کے نتیجے میں رونما ہوتا ہے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ شیطان کی چالوں کو سمجھا جائے‘ بارگاہِ ربّ العزّت میں دست بدعا رہا جائے‘ اس کی پناہ طلب کی جائے اور حسنِ عمل سے شیطان کے پھیلائے ہوئے جال کے تار و پود بکھیر دیے جائیں اور یہ ثابت کیا جائے کہ ہم خدا کے بندے ہیں‘ شیطان کے بندے ہرگز نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے حضور اکرم ﷺ سے مخاطب ہو کر کہا کہ وہ برائی کو اس طریقہ سے دفع کریں جو بہترین ہو۔ مزید فرمایا:

﴿وَقُلْ رَّبِّ اَعُوْذُ بِكَ مِنْ هَمَزٰتِ الشَّیٰطِیْنِ ﴿۹۷﴾ وَاَعُوْذُ بِكَ رَبِّ اَنْ یَّحْضُرُوْنِ ﴿۹۸﴾﴾ (المؤمنون)

’’اور دعا کرو کہ پروردگار! میں شیاطین کی اُکساہٹوں سے تیری پناہ مانگتا ہوں‘ بلکہ اے میرے رب میں تو اس سے بھی تیری پناہ مانگتا ہوں کہ وہ میرے پاس آئیں۔‘‘

❁❁❁


## ہماری ویب سائٹ

www.tanzeem.org

پر ملاحظہ کیجیے:

☆ تنظیم اسلامی کا تعارف
☆ بانیٔ تنظیم اسلامی محترم ڈاکٹر اسرار احمد کا مکمل دورۂ ترجمۂ قرآن
☆ بانیٔ تنظیم اسلامی اور امیر تنظیم اسلامی کے مختلف خطابات
☆ تلاوتِ قرآن‘ دروسِ قرآن‘ دروسِ حدیث اور خطاباتِ جمعہ
☆ صحیح بخاری‘ صحیح مسلم‘ موطا امام مالک اور اربعین نوویؒ کے تراجم
☆ میثاق‘ حکمت قرآن اور ندائے خلافت کے تازہ اور سابقہ شمارے
☆ اردو اور انگریزی کتابیں
☆ آڈیو ویڈیو کیسٹس‘ سی ڈیز اور مطبوعات کی مکمل فہرست

Visit us at www.tanzeem.org

# اہلِ سُنّت والجماعت کون؟

پروفیسر محمد یونس جنجوعہ

حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

''بنی اسرائیل بہتّر فرقوں میں تقسیم ہوئے اور میری اُمّت تہتّر فرقوں میں تقسیم ہوگی' اور یہ سب جہنمی ہوں گے سوائے ایک فرقہ کے (وہی جنّتی ہوگا)۔ صحابہؓ نے عرض کیا حضورؐ وہ کون سا فرقہ ہوگا؟ آپؐ نے فرمایا: جو اس راستے پر ہوگا جس پر میں ہوں اور میرے اصحاب ہیں۔'' (ترمذی)

آج رسول اللہ ﷺ کے اس فرمان کی صداقت ظاہر و باہر ہے۔ اُمّت مرحومہ کئی فرقوں میں بٹ چکی ہے اور ہر فرقہ اپنے آپ کو حق پر سمجھتا ہے اور مطمئن ہے۔ نہ صرف یہ بلکہ دوسروں کو حق سے منحرف سمجھتا ہے۔ ہر فرقے نے اپنا مخصوص نام رکھا ہوا ہے اور علامتیں اختیار کر رکھی ہیں اور وہ اپنے آپ کو نجات یافتہ سمجھتا ہے۔ تمام فرقے اپنے آپ کو حق اور دوسروں کو غلط ثابت کرنے کی کشاکش میں لگے ہوئے ہیں۔ ان فرقوں میں ایک فرقے کا نام ''اہلِ سنت والجماعت'' ہے۔ بلاشبہ یہ نام نہایت جامع اور خوب ہے' کیونکہ اسی فرقے کو آپؐ نے جنّتی فرمایا ہے اور یہی وہ فرقہ ہے جس کے افراد کا یہ زعم ہے کہ وہ حق پر ہیں۔ حضرت عرباض بن ساریہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

''.....تم میں سے جو میرے بعد زندہ رہے گا' وہ بڑے اختلاف دیکھے گا (تو ایسی حالت میں) تم اپنے اوپر میرے طریقے اور میرے خلفائے راشدین کے طریقے کی پیروی لازم کر لینا' اس کو مضبوطی سے تھام لینا اور دانتوں سے پکڑ لینا۔ اور دین میں نئی نکالی ہوئی باتوں سے اپنے آپ کو الگ رکھنا۔ اس لیے کہ دین میں نکالی ہوئی ہر بات بدعت ہے اور ہر بدعت گمراہی ہے۔'' (مسند احمد' سنن ترمذی' سنن ابی داؤد' سنن ابن ماجہ)

نام کی حد تک تو یہ فرقہ سب سے اعلیٰ ہے' کیونکہ اس میں رسول اللہ ﷺ کی سنت اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے تعامل پر کفایت کی گئی ہے۔ سنّتِ رسول کی اہمیت تو واضح ہے کہ



رسول اللہ ﷺ کے طریقے کو اللہ تعالیٰ نے انسانوں کے لیے نمونہ کے طور پر پیش کیا ہے۔ آپ انسانِ کامل تھے اور آپؐ کی زندگی بہترین نمونہ ہے۔ آپؐ کا ہر عمل معیار کی اعلیٰ ترین سطح پر ہے۔ اُمت کے افراد کے لیے آپ کے کردار و عمل کی کما حقہ پیروی تو ممکن نہیں' کیونکہ وہ براہِ راست اللہ تعالیٰ کی حفاظت میں تھے' ہاں ان کے طریقے پر چلنے کی افرادِ اُمت کو تعلیم دی گئی ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿وَمَا اٰتٰىكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ وَمَا نَهٰىكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا﴾ (الحشر:۷) ''جو تمہیں رسولؐ دیں وہ لے لو اور جس سے روکیں اُس سے رک جاؤ۔'' جہاں تک اصحابِ رسولؐ کی پیروی کا تعلق ہے تو ان کے عمل کو صحت کی سند رسول اللہ ﷺ نے عطا فرمائی ہے۔

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ حضرت محمد ﷺ کے اصحاب اُمت کے بہترین لوگ تھے۔ دلوں کے اعتبار سے انتہا درجے کے نیک' علم کے اعتبار سے کامل' کم تکلّف کرنے والے' اللہ نے انہیں اپنے نبی کی صحبت کے لیے اور اپنے دین کو قائم کرنے کے لیے چُن لیا تھا' پس تم ان کی بزرگی کو سمجھو اور ان کے نقش قدم پر چلو اور جہاں تک ممکن ہو ان کے عادات و اخلاق کو اختیار کرو' وہی لوگ ہدایت کے سیدھے راستے پر تھے۔ (رزین)

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی حقانیت پر رسول اللہ ﷺ کے بہت سے فرمودات کتب حدیث میں موجود ہیں۔ ایک خطبے میں آپؐ نے فرمایا: میرے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے (حقوق کی ادائیگی) کے بارے میں اللہ سے ڈرو' اللہ سے ڈرو۔ ان کو میرے بعد (سب و شتم اور طعن و تشنیع کے لیے) تختۂ مشق نہ بنانا۔ (یاد رکھو) جس نے ان سے محبت کی اس نے میری محبت کی وجہ سے ان سے محبت کی اور جس نے ان سے بغض رکھا۔ اس نے مجھ سے بغض ہی کی وجہ سے ان سے بغض رکھا۔ اور جس نے ان کو تکلیف پہنچائی اس نے مجھے تکلیف پہنچائی اور جس نے مجھے تکلیف پہنچائی' اس نے اللہ کو تکلیف دی اور اس بات کا پورا خطرہ ہے کہ (اللہ) ایسے شخص کو مبتلائے عذاب کر دے۔ (جامع ترمذی)

اصحاب النبیؐ کی فضیلت قرآن مجید میں ان الفاظ میں بیان ہوئی ہے:

﴿وَالسّٰبِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ مِنَ الْمُهٰجِرِيْنَ وَالْاَنْصَارِ وَالَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُمْ بِاِحْسَانٍ ۙ رَّضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ وَاَعَدَّ لَهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ تَحْتَهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا ۭ ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ۝﴾ (التوبۃ)

''اور مہاجرین اور انصار میں سے جنہوں نے ایمان لانے میں سبقت کی اور وہ جنہوں نے نیکوکاری کے ساتھ ان کی پیروی کی اللہ ان سے خوش ہے اور وہ اللہ سے خوش ہیں' اور اُس نے ان کے لیے باغات تیار کیے ہیں جن کے نیچے نہریں بہہ رہی ہیں' وہ ہمیشہ ان میں رہیں گے۔ یہ ہے بڑی کامیابی۔''

گویا صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو اللہ تعالیٰ کے ہاں قبولیت کا درجہ حاصل ہے اور وہ لوگ بھی حقیقی کامیابی کے ساتھ بہرہ مند ہوں گے جو ان کی پیروی کریں گے۔

پس اہلِ سنت والجماعت یعنی سنت رسولؐ پر عمل کرنے والے اور اصحابِ رسولؐ کے طریقہ پر چلنے والے کامیاب و کامران ہیں۔ لیکن صرف نام ہی کافی نہیں ہوتا۔ جس شخص کا نام غلام محمد ہے وہ اسم بامسمیٰ تبھی ہوگا جب وہ اپنے اخلاق و اعمال میں رسول اللہ ﷺ کی اطاعت کرتا ہو اور اگر ایسا نہ ہو تو اس کا نام نرا دھوکہ ہے۔ اسی طرح اہل سنت والجماعت وہی شخص ہوگا جو صحیح معنوں میں رسول اللہ ﷺ کا مطیع فرمان اور صحابہ کے طرزِ حیات کو اپنائے ہوئے ہو' یعنی اہل سنت والجماعت کا دعویٰ کرنے والے شخص کو ثبوت میں اپنے کردار و عمل کو پیش کرنا ہوگا۔

سب سے پہلے عقائد ہیں اور پھر عمل۔ اہل سنت والجماعت وہ ہیں جو توحید و رسالت پر پختہ ایمان رکھتے ہوں۔ توحید یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ خالق کائنات ہے' وہ تنہا ہے' اس کا کوئی شریک نہیں' اس کا کوئی مثل نہیں۔ وہ اپنی ذات اور صفات میں ہر طرح کے شرک سے پاک ہے۔ اللہ تعالیٰ عالم الغیب ہے۔ وہ ہر جگہ موجود ہے۔ وہ بے نیاز ذات ہے' اس کو کسی کی احتیاج نہیں' جبکہ مخلوق کا ہر فرد اس کا محتاج ہے۔ یہ ہے توحید پر ایمان کا عقیدہ۔ یہی قرآن کی تعلیم ہے اور یہی رسول اللہ ﷺ کے طرزِ عمل اور تعاملِ صحابہؓ سے ثابت ہے۔ اصحابِ رسولؐ توحید خالص کو مانتے تھے۔ وہ مخلوق کے کسی فرد کو نہ عالم الغیب مانتے تھے نہ حاضر و ناظر۔ ان کا پختہ یقین تھا کہ جس طرح عبادت **اللّٰہ وحدہٗ لا شریک لہٗ** کی ہے اسی طرح استعانت بھی اُسی سے ہے' اور یہی مطلب ہے **اِیَّاکَ نَعْبُدُ وَاِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ** کا۔ اب وہ کس طرح کا اہل سنت والجماعت ہے جس کے نزدیک اللہ کے کچھ بندے غیب دان ہوتے ہیں' کچھ ہر وقت ہر جگہ ہوتے ہیں اور ہر شے پر ہر وقت نظر رکھتے ہیں۔ جس کی توحید ہی خالص نہیں ہے وہ کیسا اہل سنت والجماعت ہے؟

پھر عملی اعتبار سے دعا صرف اللہ کا حق ہے۔ دعا عبادت کا مغز ہے۔ اللہ کے سوا کسی کے آگے ہاتھ پھیلانا نہ سنت سے ثابت ہے نہ تعاملِ صحابہ سے۔ فوت شدہ بزرگوں کے سامنے اپنی حاجات بیان کرنا اور ان سے مدد چاہنا کیسا ہے؟ سنت تو یہ ہے کہ فوت ہونے والے کی نمازِ



جنازہ پڑھی جائے' پھر دفن کیا جائے اور بار بار اللہ تعالیٰ سے اس کی بخشش کی دعا کی جائے۔ قبر کو پختہ نہ کیا جائے اور نہ ہی اس پر کوئی عمارت بنائی جائے۔ مسلمانوں کے قبرستان میں جا کر دیکھئے جا بجا پختہ قبریں نظر آئیں گی اور ان پر کتبے لگے ہوئے ہیں۔ کچھ پر عمارتیں بنائی گئی ہیں۔ کیا اللہ کے رسولؐ نے اس کی اجازت دی ہے یا یہ اُسوۂ حسنہ اور سنّتِ صحابہؓ سے ثابت ہے؟ یاد رکھئے رسول اللہ ﷺ کا طریقہ ہی بہترین طریقہ ہے۔ جمعہ کے خطبہ میں اکثر آپ نے یہ الفاظ سنے ہوں گے: **خَیْرُ الْھَدْیِ ھَدْیُ مُحَمَّدٍ ﷺ** ''بہترین طریقہ محمد ﷺ کا طریقہ ہے''۔ پس اسی بہترین طریقے کو اختیار کرنے کا حکم اللہ نے دیا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے قبروں کو پختہ کرنے' ان پر عمارت بنانے یا ان پر بیٹھنے سے منع فرمایا ہے۔ (مسلم)

ایک حدیث میں قبروں پر چراغ جلانے والوں پر لعنت کی گئی ہے۔ رسول اللہ ﷺ کی تین بیٹیاں آپ کے سامنے فوت ہوئیں' اُن کا کفن دفن آپؐ نے کیا' آپ نے ان کی قبروں کو نہ پختہ کیا نہ ان پر عمارتیں بنائیں اور نہ نام کی تختی لگائی۔ اس کے بعد اصحابِ رسولؐ کا طریقہ بھی یہی رہا۔ جو مسلمان رسول اللہ ﷺ اور اصحابِ رسولؐ کے عمل کے خلاف عمل کرتا ہے وہ کیسا اہلِ سنت والجماعت ہے؟ وہ تو سنت نبویؐ کو چھوڑ کر اپنی چاہت پوری کر رہا ہے۔

جس طرح عبادت اور استعانت صرف اللہ کی ہے اسی طرح نذر و نیاز بھی اللہ کے نام کی ہی ہے۔ فوت شدہ بزرگوں کے مزاروں پر منتیں ماننا اور نیازیں چڑھانا کس کا طریقہ ہے؟ رسول اللہ ﷺ نے تو قبر پختہ کرنے سے ہی منع فرما دیا ہے تو قبروں پر نذر و نیاز کیسی؟ ظاہر ہے کہ جب رسول اللہ ﷺ کے حکم اور عمل کو چھوڑ کر اپنی خواہش کے مطابق کام کیا جائے گا تو اس کا نتیجہ اچھا نہیں نکل سکتا۔ آج آپ دیکھتے ہیں کہ قبروں پر کیا کچھ ہو رہا ہے' ان کو غسل دیا جا رہا ہے' چادریں چڑھائی جا رہی ہیں' انہیں پختہ کیا جا رہا ہے' ان پر چڑھاوے چڑھائے جا رہے ہیں۔ کیا یہ اُسوۂ حسنہ سے ثابت ہے؟ کیا خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم نے ایسا کیا؟ ہرگز نہیں! تو وہ کیسے اہل سنت والجماعت ہیں جو قبروں پر میلے لگا رہے ہیں اور کئی طرح کے غیر مسنون کام کر رہے ہیں۔

رسول اللہ ﷺ نے نکاح کو اپنی سنت قرار دیا ہے۔ آپؐ نے خود نکاح کیے' اپنی بیٹیوں کی شادیاں کیں۔ آپؐ کا اُسوۂ حسنہ ہمارے سامنے ہے۔ آپؐ نے سادگی کے ساتھ خاتونِ جنت حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کا نکاح حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ساتھ کیا اور اسی سادگی کے ساتھ گھر سے رخصت کیا۔ نہ کوئی برات تھی' نہ جہیز تھا نہ دعوت تھی۔ اسی طرح حضراتِ صحابہ رضی اللہ عنہم کا عمل تھا۔

اب رسول اللہ ﷺ کے طریقے اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے عمل کو چھوڑ کر برات اور جہیز کو شادی کا لازمہ سمجھ لیا گیا ہے۔ بیٹی کو ہندوؤں کے طریقے کے مطابق جہیز تو دیا جاتا ہے مگر وراثت سے محروم رکھا جاتا ہے۔ اسی طرح کی دوسری بہت سی خود ساختہ یا ہندوانہ رسمیں شادی کے موقع پر ضروری سمجھی جاتی ہیں۔ عورتوں اور مردوں کا مخلوط اجتماع ہوتا ہے' بے پردگی ہوتی ہے' ستر و حجاب کی قرآنی تعلیم کی خلاف ورزی کی جاتی ہے' دلہن کو قرآن مجید کے نیچے سے گزارا جاتا ہے۔ کیا رسول اللہ ﷺ نے اپنی بیٹیوں کو رخصت کرتے وقت ایسا کیا تھا؟ کیا اس وقت قرآن مجید موجود نہ تھا؟ اللہ کے رسولؐ کے طریقے اور اصحابِ رسولؐ کے عمل کو چھوڑ کر خود ساختہ تکلّفات کو ضروری سمجھنا اور اسراف و تبذیر اور نمود و نمائش کو اختیار کرنا کیا یہ کسی اہل سنت والجماعت کو زیب دیتا ہے؟ ہماری بیٹیاں جن کے لیے ہم یہ بے جا تکلفات اختیار کرتے ہیں خاتونِ جنت رضی اللہ عنہا کے پاؤں کی خاک کے برابر بھی نہیں ہیں۔ نکاح اور شادی کا بہترین طریقہ وہی ہے جو آپ ﷺ نے اختیار فرمایا۔ یہی مطلب ہے ''خَيْرُ الْهَدْيِ هَدْيُ مُحَمَّدٍ ﷺ'' کا اور اسی بہترین طریقے کو صحابہ کرامؓ نے اپنایا۔

کئی اہلِ سنت والجماعت کا دعویٰ رکھنے والے ایسے بھی ہیں جو تارکِ نماز ہیں مگر صرف زبانی طور پر عاشقِ رسول ہیں۔ کیا فرض نماز کو کبھی چھوڑا جا سکتا ہے؟ مسائل کی کتابوں میں دیکھئے' وہاں رسول اللہ ﷺ کا طریقہ واضح کیا گیا ہے کہ آپؐ نے سفر میں بھی نماز ادا کی' بیماری میں بھی' حتیٰ کہ کفار کے ساتھ جنگ جاری ہو تو اس وقت بھی آپ ﷺ نے اللہ کے حکم کے مطابق نماز ادا کی ہے۔ ترکِ صلوٰۃ کو آپؐ نے کفر قرار دیا ہے۔ کتنے اہلِ سنت والجماعت ہیں جو اس کفر کو اختیار کیے بیٹھے ہیں اور مطمئن ہیں۔ پانچ وقت مسجد سے نماز کا بلاوا سنتے ہیں کہ نماز کی طرف آؤ' کامیابی کی طرف آؤ مگر ٹس سے مس نہیں ہوتے۔ وہ بھی اپنے کو اہل سنت والجماعت قرار دے رہے ہیں۔ یہی حال باقی فرائض دینی کا ہے۔

یاد رکھئے رسول اللہ ﷺ کے فرمان کے مطابق یقیناً ناجی (نجات یافتہ) فرقہ اہل سنت والجماعت ہی ہے' لیکن اہل سنت والجماعت کو نجات یافتہ فرقہ سمجھنے والوں کو ان الفاظ کا مطلب بھی سمجھنا ہوگا۔ جب عمل اور کردار سنت رسول اور عمل صحابہؓ کے مطابق نہ ہوگا تو صرف نام سے نہ اللہ کو دھوکا دیا جا سکتا ہے اور نہ رسول اللہ ﷺ کو۔ ایسا معاملہ نہ ہو کہ برعکس نہند نام زنگی کافور۔ قرآن مجید میں ہے کہ اللہ کو دھوکہ دینے والے اللہ کو نہیں بلکہ خود اپنے آپ کو دھوکہ دیتے ہیں۔



جب مہلتِ عمر ختم ہوگئی تو صرف پچھتاوا ہی پچھتاوا رہ جائے گا اور کچھ بن نہ پڑے گا' کیونکہ نافرمانیوں کی تلافی کا وقت گزر چکا ہوگا۔ اوامر و نواہی میں غلطی ہو جانا یا کبھی کوتاہی ہو جانا اور بات ہے' جبکہ جان بوجھ کر خلافِ سنت کاموں کو اپنائے رکھنا اور بات ہے۔ کبھی کسی عذر کی بنا پر نماز کا قضا ہو جانا ممکن ہے' مگر کسی مسلمان کا بے نمازی ہو جانا ممکن نہیں ہے۔

کسی بڑے چھوٹے کے کہنے پر یا کسی کی پیروی کرتے ہوئے رسول اللہ ﷺ کے فرامین کی خلاف ورزی کسی مسلمان کو زیب نہیں دیتی چہ جائیکہ وہ اہل سنت والجماعت کا دعوے دار ہو۔ کیا کوئی اہل سنت والجماعت:

(۱) تارک نماز ہو سکتا ہے؟

(۲) اسلام کو مکمل دین سمجھنے کے باوجود بدعات اختیار کر سکتا ہے؟

(۳) شادی بیاہ کے موقع پر فضول خرچی' نمود و نمائش اور غیر مسنون رسمیں اختیار کر سکتا ہے؟

(۴) رسول اللہ ﷺ کے منع کرنے کے باوجود قبریں پختہ بنا سکتا ہے؟

(۵) اللہ کے سوا دوسروں سے استعانت کر سکتا ہے؟

(۶) قبروں پر چادریں چڑھانے اور غسل دینے کو ثواب کا باعث سمجھ سکتا ہے؟

(۷) بیٹیوں کو وراثت سے محروم کر سکتا ہے؟

ہرگز نہیں! تو جو مسلمان ایسا کرتا ہے اسے حق نہیں پہنچتا کہ وہ اہل سنت والجماعت ہونے کا دعویٰ کرے۔

کسی وقت غفلت کے نتیجہ میں کوئی نماز قضا ہو جائے یا خلافِ سنت کوئی کام سرزد ہو جائے تو وہ اور بات ہے' کیونکہ انسان خطا کا پتلا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا وعدہ ہے کہ ''اگر تم بڑے بڑے گناہوں سے بچتے رہو گے تو ہم معاف کر دیں گے تم سے تمہارے چھوٹے گناہ اور داخل کریں گے تم کو عزت کے مقام میں۔'' (النساء:۳۱) مگر مسلمان کو یہ زیب نہیں دیتا کہ اللہ اور رسول کے احکام کو جانتے بوجھتے ترک کرے اور جن کاموں سے آپ نے روکا ہے ان کو بلا دھڑک اختیار کرے۔ ایک مسلمان کے لیے یہ کسی طرح مناسب نہیں کہ رسول اللہ ﷺ کے اوامر و نواہی کی مستقل خلاف ورزی کر کے اللہ اور رسول کو ناراض کرے۔ اہل سنت والجماعت ہونے کے لیے سنتِ رسولؐ اور عملِ صحابہؓ کو پورے ذوق شوق اور خوش دلی کے ساتھ قبول کرنا اور پورے خلوص کے ساتھ اس پر عمل کرنا ضروری ہے۔

# تحریکِ تجدّد اور متجدّدین (۲)

حافظ محمد زبیر

گزشتہ شمارے میں مصر میں جدیدیت کی تحریک کے بارے میں بحث کو چار ذیلی حصوں میں تقسیم کر کے پہلے حصے ''مصلحینِ اُمت'' کے ضمن میں سید جمال الدین افغانی کے افکار و نظریات زیر بحث آئے تھے۔ اب ہم دیگر مصلحین کے حالات اور افکار و نظریات سے آگاہی حاصل کرتے ہیں۔

## مفتی محمد عبدہٗ

ان کا مکمل نام محمد بن عبدہ بن حسن بن خیر اللہ ہے۔ ۱۲۶۵ھ بمطابق ۱۸۴۹ء میں پیدا ہوئے۔ محلے کی ایک مسجد میں ہی صرف و نحو کی ابتدائی تعلیم حاصل کی' لیکن ان کے بقول تقریباً دو سال کے عرصے میں انہیں نحو کا ایک لفظ بھی سمجھ نہ آیا۔ اس کا الزام وہ مدارس کے قدیم نصاب اور طریقۂ تعلیم کو دیتے تھے۔ ۱۲۸۲ھ میں تقریباً ۱۷ سال کی عمر میں شادی ہوئی۔ شادی کے بعد ان کے والد نے انہیں پھر ایک قدیم مدرسے میں زبردستی تعلیم کے لیے بھیج دیا جس سے وہ راستے میں ہی بھاگ گئے۔ ان کے بقول مدارس کے قدیم نصابِ تعلیم اور طریقۂ تدریس نے ان میں مذہبی تعلیم سے بیزاری اور بغاوت پیدا کر دی تھی اور اس قدیم نصاب اور طریقۂ تعلیم سے ۹۵ فی صد سے زائد طلبہ کچھ حاصل نہ کر پاتے تھے۔ وہ اس نصابِ تعلیم اور طریقۂ تدریس میں انقلابی تبدیلیوں کے قائل تھے۔ اسی دوران وہ اپنے ایک چچا شیخ درویش کے ہاتھ لگ گئے جو تصوّف کی راہ کے مسافر تھے' جنہوں نے ان کی روحانی تربیت کی اور انہیں دوبارہ مذہبی تعلیم کی طرف متوجّہ کیا اور ان میں اس کا ذوق و شوق بیدار کیا۔ انہوں نے اپنے شیخ اور چچا کی رہنمائی میں سلوک کی کئی منازل طے کیں اور اپنے کئی ایک روحانی تجربات بھی بیان کیے ہیں۔

۱۲۸۷ھ میں سید جمال الدین افغانی کی قاہرہ آمد پر ان سے ریاضی' فلسفہ اور علم کلام کی تعلیم حاصل کی اور ان کے طرز تدریس اور افکار سے اس قدر متاثر ہوئے کہ انہی کے ہو کر رہ گئے۔ ۱۸۶۶ء میں جامعہ ازہر سے تعلیم کے لیے منسلک ہوئے اور ۱۲۹۴ھ بمطابق ۱۸۷۷ء میں جامعہ ازہر سے شہادۃ العالمیہ کا امتحان پاس کیا۔ جامعہ ازہر میں تعلیم کے حصول کے دوران بھی ان پر تصوف' عبادت اور مجاہدۂ نفس کا غلبہ رہا۔ وہ ساری ساری رات عبادت میں مشغول رہتے تھے۔ ان کے بقول انہیں جذب و کشف کی اس دنیا سے ان کے استاذ سید جمال الدین افغانی باہر نکال کر لائے۔ ۱۸۷۹ء میں مدرسہ 'دار العلوم' میں مدرّس کے طور پر تدریس کا آغاز کیا۔ ۱۸۸۲ء میں انگریزوں کی حکومت کے خلاف احمد عرابی پاشا کے انقلاب میں اپنے استاذ جمال الدین افغانی کے ساتھ شریک رہے۔ اس تحریک کی ناکامی پر جیل بھیجے گئے اور بعد ازاں ان کو زبردستی بیروت بھیج دیا گیا۔ ۱۸۸۴ء میں اپنے استاذ کی دعوت پر پیرس تشریف لے گئے اور 'العُروۃ الوثقٰی' نام سے ایک عربی رسالہ جاری کیا۔ ۱۸۸۵ء میں پھر بیروت آ گئے اور 'العُروۃ الوثقٰی' کے نام سے ہی ایک خفیہ تحریک کی بنیاد رکھی۔

۱۸۸۹ء میں حکومت کے ساتھ اس معاہدے پر اتفاق کرتے ہوئے کہ آئندہ وہ کسی قسم کا سیاسی کام نہیں کریں گے' مصر واپس آ گئے اور انہیں ابتدائی عدلیہ میں جج مقرر کر دیا گیا۔ بعد ازاں انہیں مجلس قانون ساز کا رکن بھی مقرر کیا گیا۔ ۱۸۹۹ء میں ان کو مصر کی حکومت کی طرف سے سرکاری طور پر مفتی عام کا درجہ دے دیا گیا اور وہ مصر کے پہلے مفتی عام تھے۔ ۱۹۰۰ء میں مخطوطات کی نشر و اشاعت کے لیے 'جمعیۃ احیاء العلوم العربیۃ' کی بنیاد رکھی۔ ۱۹۰۵ء بمطابق ۱۳۲۳ھ میں اسکندریہ کے علاقہ میں کینسر کے مرض کی وجہ سے وفات پائی۔ ان کے شاگردوں میں رشید رضا' حافظ ابراہیم' شیخ عزالدین قسام' شیخ ازہر محمد مصطفیٰ مراغی' شیخ ازہر مصطفیٰ عبدالرزاق' شیخ محمد محی الدین عبدالحمید' سعد زغلول' قاسم امین' محمد لطفی جمعہ اور طٰہٰ حسین وغیرہ شامل ہیں۔

مفتی محمد عبدہٗ اپنی زندگی میں نوجوانوں کی ایک ایسی جماعت تیار کرنا چاہتے تھے جو عربی زبان اور علوم اسلامیہ کا احیا کریں اور مصری حکومت اور حکمرانوں کی بذریعہ تعلیم اصلاح کریں۔ ان کا اپنے استاذ سید جمال الدین افغانی سے یہ اختلاف تھا کہ وہ انقلاب کے لیے سیاست کی بجائے تعلیم کو بنیاد بناتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ جب انہیں شیخ ازہر بنایا گیا تو وہ جامعہ ازہر کے نصاب اور مناہج تعلیم' طریقہ تدریس' اندازِ فکر اور نظم و ضبط میں انقلابی تبدیلیاں لے کر آئے۔ انہوں نے تقلیدی جمود کے برعکس جمیع فقہی مذاہب اسلامیہ سے برابری کی سطح پر

استفادہ کی دعوت پر زور دیا۔ ان کے بعد آنے والے شیوخ الازہر کی ایک بڑی تعداد نے اپنے فتاویٰ میں ان کے اس منہج کو برقرار رکھا' بلکہ شیخ مصطفیٰ المراغی کے زمانے میں حنفی' مالکی' شافعی اور حنبلی علماء کی ایک گیارہ رکنی کمیٹی بنا دی گئی تھی جو مختلف مسائل میں اتفاقی فتویٰ جاری کرتی تھی۔ مفتی محمد عبدہٗ کے بعد بہت سے شیوخ الازہر حنفی ہونے کے باوجود کئی ایک مسائل میں امام ابن تیمیہؒ کے موقف پر فتویٰ جاری کرتے تھے۔

## کتب کا تعارف

۱) 'واردات' ان کی پہلی کتاب ہے جو ۱۸۷۴ء میں شائع ہوئی۔ یہ کتاب انہوں نے صوفیاء کے منہج پر علمِ کلام اور توحید کے بیان میں لکھی ہے۔ چارلس ایڈیمس کے بقول ان کی اس کتاب سے ان کے ذہن پر وجودیت (pantheism) کا تسلّط واضح نظر آتا ہے۔ ۲) وحدت الوجود کے بارے بھی ان کا ایک رسالہ موجود ہے۔ ۳) اسماعیل پاشا کی تاریخ پر بھی ایک کتاب لکھی۔ ۴) نہج البلاغہ کی ایک شرح لکھی۔ ۵) بدیع الزمان ہمذانی کے 'مقامات' کی شرح لکھی۔ ۶) منطق میں 'شرح البصائر النصيرية' کے نام سے کتاب لکھی۔ ۷) 'مصر میں تعلیم و تربیت کا نظام' کے عنوان سے بھی کتاب لکھی۔ ۸) اتحاد بین المذاہب پر ایک رسالہ 'رسالة التوحيد' کے نام سے لکھا اور یہ ان کی معروف ترین کتابوں میں سے ہے۔ بعض عیسائیوں نے اس کتاب کے چند مباحث حذف کرنے کے بعد اس کو اپنے اداروں میں بطور نصاب بھی مقرر کیا ہوا ہے۔

جامعہ ازہر میں محرم ۱۳۱۷ھ میں تفسیر کی تدریس کا آغاز کیا جو ۱۳۲۳ھ تک جاری رہا۔ اس دوران انہوں نے سورۃ النساء کی آیت ۱۲۵ تک تفسیر مکمل کی جو تفسیر 'المنار' کے نام سے پہلی پانچ جلدوں میں موجود ہے اور طبع شدہ ہے۔ تفسیر 'المنار' مفتی محمد عبدہٗ کے شاگرد رشید رضا نے مکمل کرنے کی کوشش کی ہے۔ شیخ رشید رضا کی تفسیر سورۃ النساء کی آیت ۱۲۶ سے لے کر سورۂ یوسف تک 'تفسیر المنار' کے نام سے مطبوع ہے۔

## افکار و نظریات

مفتی محمد عبدہٗ تقلید کے مخالف' آزادیٔ فکر اور سلف صالحین کے منہج پر بذاتِ خود دین کو سمجھنے کے قائل تھے۔ عقل و نقل میں تعارض ہو جائے تو عقل کی ترجیح کے قائل تھے اور اس ترجیح کو علمائے اہلِ سنّت کے ہاں اتفاقی مسئلہ قرار دیتے تھے۔ اپنے استاد سید جمال الدین افغانی کے ساتھ عالمی ماسونی تحریک کی مجالس میں بھی شریک ہوتے تھے' لیکن اس شرکت کے مقاصد کیا



تھے یہ واضح نہ ہو سکے۔ وطنیّت کے فلسفہ کے شدّت سے قائل تھے اور اسی بنا پر انہوں نے مصر میں مسلمانوں اور قبطیوں کے مابین اختلاف میں قبطیوں کے حق میں لکھا۔

ڈاکٹر محمد عمارہ اور دیگر محقّقین کے نزدیک مفتی محمد عبدہٗ کے شاگرد قاسم امین مصری کی کتاب 'تحرير المرأة المُسلمة' کا اکثر حصہ مفتی محمد عبدہٗ کا ہے جبکہ اس کا کچھ حصہ قاسم امین نے لکھا تھا۔ بعد میں اس کتاب پر مفتی محمد عبدہٗ نے نظرِ ثانی کی تاکہ مکمل کتاب کا منہج اور اسلوب یکساں ہو جائے۔ اس کتاب میں انہوں نے کہا ہے کہ عورت کے لیے اپنے چہرے کو چھپانا شرعاً یا آداباً واجب نہیں ہے بلکہ یہ اہلِ عرب کا رواج تھا جو آج تک چلا آ رہا ہے اور اُمت اس رواج پر کبھی بھی متفق نہ ہو سکی۔ ہاتھ' پاؤں اور چہرے کے علاوہ جسم کے ڈھانپنے کو وہ شرعی حکم میں داخل سمجھتے ہیں۔ اسی طرح انہوں نے تعدّدِ ازواج کو بھی اللہ کے رسول ﷺ کے دور کی ایک ضرورت قرار دیا ہے اور عصرِ حاضر میں اس کی ممانعت کے قائل تھے۔ اس کتاب میں ان کا یہ بھی کہنا ہے کہ ستر و حجاب کے تقاضوں کو پورا کرتے ہوئے عورتوں اور مردوں کا اختلاط جائز ہے اور اللہ کے رسول ﷺ نے جس اختلاط سے منع کیا ہے' وہ ایک مرد اور عورت کا تنہا ہونا ہے۔ طلاق کے اکثر مسائل میں انہوں نے فقہ حنفی یا جمہور فقہاء کے خلاف امام ابن تیمیہ اور ظاہریہ کے مسلک کو ترجیح دی ہے۔

ڈاکٹر محمد عمارہ نے 'الأعمال الكاملة لمحمد عبده' میں لکھا ہے کہ مفتی محمد عبدہ کے نزدیک عقیدہ میں خبر واحد حجت نہیں ہے۔ اسی طرح 'منهج المدرسة العقلية الحديثية للرومي' میں ہے کہ مفتی محمد عبدہٗ وحدتِ ادیان کے فلسفہ کے قائل تھے۔ شیخ یوسف نبہانی نے مفتی محمد عبدہٗ پر ایک نظم لکھی ہے جس میں انہوں نے انہیں شیخ فاسق قرار دیا ہے اور ان پر یہ الزام عائد کیا ہے کہ وہ بعض اوقات نماز ترک کر دیتے تھے اور انہوں نے باوجود استطاعت کے حج بھی نہ کیا جبکہ وہ بڑے بڑے حکومتی عہدوں مثلاً مفتی مصر' شیخ الازہر' رکن مجلس قانون ساز وغیرہ پر فائز رہے تھے۔ دجال کے ظہور سے مراد شخص دجّال نہیں لیتے تھے بلکہ اس سے مراد فتنہ دجّالیت لیتے تھے۔ سورۃ الفیل کی تفسیر میں 'طيرًا ابابيل' سے پرندوں کی بجائے مچھر اور مکھیاں مراد لی ہے اور کہا ہے کہ ان کے پتھر مارنے سے مراد ان کا کاٹنا ہے جس سے جراثیم مخالفین کے جسم میں گھس کر انہیں ہلاک کر دیتے تھے۔

## تفسیرِ قرآن میں تاویلات

اب ہم مفتی محمد عبدہٗ کی تفسیر کے چند مقامات قارئین کے سامنے پیش کرنا چاہیں گے جس

میں انہوں نے تکلّف کے ساتھ قرآن کی تفسیر عقلی منہج پر کرنے کی کوشش کی ہے۔ سورۃ البقرۃ کی آیت ۵۰ ﴿وَاِذْ فَرَقْنَا بِكُمُ الْبَحْرَ﴾ کی تفسیر میں مفتی محمد عبدہٗ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے عصا کے ذریعے سمندر کے پھٹ جانے کے معجزہ کا اقرار کیا ہے اور معجزات پر ایمان کو من جملہ ایمانیات میں شامل قرار دیا ہے۔ انہوں نے ان لوگوں کی تاویلات کا رد بھی کیا ہے جو اس معجزے کی عقلی توجیہہ سمندر کے مدّ و جزر سے کرتے ہیں' جیسا کہ سرسید کا موقف ہے۔

سورۃ البقرہ کی آیت ۶۳ ﴿وَرَفَعْنَا فَوْقَكُمُ الطُّوْرَ﴾ کے ذیل میں طور پہاڑ کے حسی طور پر بنی اسرائیل پر اٹھائے جانے کا انکار کیا ہے اور اس سے پہاڑ کا زلزلہ اور اس کے سایہ کا ان پر چھا جانا مراد لیا ہے۔ اسی طرح سورۃ البقرۃ کی آیت ۷۳ ﴿فَقُلْنَا اضْرِبُوْهُ بِبَعْضِهَا ؕ كَذٰلِكَ يُحْيِ اللّٰهُ الْمَوْتٰى﴾ میں احیائے موتیٰ کے معجزہ کی تاویل کی ہے۔ گائے کے گوشت کا ٹکڑا مقتول کو مارنے کی انہوں نے یہ تاویل کی ہے کہ بنی اسرائیل میں یہ رواج تھا کہ جس بستی میں کوئی شخص قتل کیا جاتا اور قاتل کا علم نہ ہوتا تو جو شخص اس رسم کے مطابق عمل کر لیتا تھا تو وہ مقتول کے خون سے بری ہو جاتا تھا اور جو اس رسم کے مطابق عمل نہ کرتا تھا اس پر قتل کا الزام عائد ہو جاتا تھا۔ اس آیت میں مُردوں کو زندہ کرنے کی انہوں نے یہ توجیہہ کی ہے کہ اس سے مراد قانونِ قصاص ہے کیونکہ قصاص کے بارے میں کہا گیا ہے کہ اس میں تمہارے لیے زندگی ہے۔ سورۃ البقرۃ کی آیت ۸۱ ﴿بَلٰى مَنْ كَسَبَ سَيِّئَةً وَّاَحَاطَتْ بِهٖ خَطِيْٓئَتُهٗ فَاُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ۝۸۱﴾ کی تفسیر میں انہوں نے گناہ کبیرہ پر استمرار اور عدمِ توبہ کو ایمان کے منافی قرار دیا ہے اور ایسے گناہ کبیرہ کے مرتکبین کلمہ گو مسلمانوں کو دائمی جہنمی قرار دیا ہے اور اس مسئلے میں معتزلہ کا نام لے کر ان کے مسلک کو قرآن کی نص کے قریب قرار دیا ہے۔ سورۃ البقرہ کی آیت ۸۵ ﴿اَفَتُؤْمِنُوْنَ بِبَعْضِ الْكِتٰبِ وَتَكْفُرُوْنَ بِبَعْضٍ ۚ﴾ کی تفسیر میں کہا ہے کہ اگر مسلمان گناہ کبیرہ کا ارتکاب کرتا ہے اور اس پر اسے شرمندگی نہیں ہوتی اور نہ ہی وہ توبہ کرتا ہے بلکہ اس گناہ کا ارتکاب جاری رکھتا ہے تو ایسا کلمہ گو مسلمان کافر ہے۔

سورۃ البقرۃ کی آیت ۸۷ ﴿وَاَيَّدْنٰهُ بِرُوْحِ الْقُدُسِ﴾ میں روح القدس سے مراد وحی لی ہے جبکہ مفسّرین اس سے مراد حضرت جبرائیلؑ لیتے ہیں۔ اسی طرح انہوں نے ﴿نَزَلَ بِهِ الرُّوْحُ الْاَمِيْنُ﴾ سے بھی وحی ہی مراد لی ہے۔ سورۃ البقرۃ کی آیت ۱۰۲ ﴿وَمَآ اُنْزِلَ عَلَى الْمَلَكَيْنِ بِبَابِلَ هَارُوْتَ وَمَارُوْتَ ؕ﴾ کے بارے میں کہا ہے کہ اس میں 'مَلَکَیْن' سے مراد دو عام انسان ہی تھے لیکن ان کو فرشتہ اس لیے کہا گیا ہے کہ لوگ ان کو فرشتہ سمجھتے تھے یا مجازاً فرشتہ



کہہ دیا گیا ہے۔ سورۃ البقرۃ کی آیت ۲۴۳ ﴿فَقَالَ لَهُمُ اللّٰهُ مُوْتُوْا ثُمَّ اَحْيَاهُمْ ؕ﴾ کے بارے میں فرماتے ہیں کہ اس میں موت سے مراد دشمن کے سامنے مغلوب و مقہور ہونا ہے اور دوبارہ زندہ کرنے سے مراد دوبارہ آزادی اور قوت دینا ہے۔ سورۂ آل عمران کی آیت ۳۷ ﴿كُلَّمَا دَخَلَ عَلَيْهَا زَكَرِيَّا الْمِحْرَابَ وَجَدَ عِنْدَهَا رِزْقًا ۚ قَالَ يٰمَرْيَمُ اَنّٰى لَكِ هٰذَا ؕ قَالَتْ هُوَ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ ؕ﴾ میں اس واقعے کے خرقِ عادت میں سے ہونے کا انکار کیا ہے اور یہ الزام عائد کیا ہے کہ متقدمین نے قرآن میں اکثر و بیشتر مقامات پر تفسیر کرتے ہوئے خرقِ عادت واقعات کا اثبات من گھڑت اسرائیلیات سے کیا ہے جو تفسیر کا درست منہج نہیں ہے۔ سورۂ آل عمران کی آیت ۴۹ ﴿وَاُحْيِ الْمَوْتٰى بِاِذْنِ اللّٰهِ﴾ میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے مُردوں کو زندہ کرنے کے معجزات کے بارے میں کہا ہے کہ اس میں توقف کرنا چاہیے اور قرآن میں کوئی ایسی بات نہیں ہے جس سے یہ ثابت ہوتا ہو کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام مُردوں کو زندہ کرتے تھے۔ سورۂ آل عمران کی آیت ۵۵ ﴿اِذْ قَالَ اللّٰهُ يٰعِيْسٰٓى اِنِّيْ مُتَوَفِّيْكَ وَرَافِعُكَ اِلَيَّ﴾ کے ذیل میں نزولِ مسیح کا انکار کیا ہے اور احادیث میں نزولِ مسیحؑ سے ان کی حقیقی تعلیمات کا دنیا میں غلبہ مراد لیا ہے۔ سورۂ آل عمران کی آیات ۱۱۳ تا ۱۱۵ کے ذیل میں یہ بیان کیا ہے کہ اہلِ کتاب اگر اپنے بچے کھچے دین پر صحیح معنوں میں عمل کرتے ہیں' چاہے وہ اسلام نہ بھی قبول کریں' تو اللہ کے ہاں متقین اور صالحین میں شمار ہوں گے۔

## محمد رشید رضا

ان کا نام محمد رشید بن علی رضا بن محمد شمس الدین بن سید بہاء الدین ہے۔ اپنے والد اور والدہ کی طرف سے اپنے نسب کی نسبت آل بیت کی طرف کرتے تھے۔ ان کی ولادت ۲۷ جمادی الاولیٰ ۱۲۸۲ھ بمطابق ۱۸۶۵ء شام کے علاقہ طرابلس کے جنوب میں سمندر کے کنارے آباد ایک بستی 'قلمون' میں ہوئی۔ ابتدائی تعلیم طرابلس کے 'مدرسہ رشیدیہ' میں حاصل کی' یہاں تعلیم ترکی زبان میں دی جاتی تھی کیونکہ یہ مدرسہ سلطنتِ عثمانیہ کے تابع تھا۔ بعد ازاں طرابلس میں ہی 'مدرسہ وطنیہ اسلامیہ' سے منسلک ہو گئے جس کے پرنسپل شیخ حسین الجسر تھے اور یہاں عربی' ترکی اور فرانسیسی میں تعلیم دی جاتی تھی۔ کچھ عرصہ بعد یہ مدرسہ بوجوہ بند ہو گیا تو رشید رضا نے دوسرے مدارس کا رخ کیا اور شیخ حسین سے بھی ممکن حد تک استفادہ کرتے رہے۔ محمد رشید رضا کی زندگی پر دو اشخاص کے اثرات اور افکار کا غلبہ رہا' ان میں سے ایک تو

شیخ حسین تھے اور دوسرے مفتی محمد عبدہٗ۔

انہوں نے امام غزالی کی کتاب 'احیاء العلوم' کا مطالعہ کیا تو تصوف کی طرف مائل ہوگئے۔ عبادات اور مجاہدات میں اس قدر مشغول ہوئے کہ بعض اوقات انہیں یوں محسوس ہوا کہ ان کا جسم موجود ہی نہیں ہے۔ انہوں نے اپنے بعض روحانی تجربات بھی بیان کیے ہیں۔ انہوں نے شروع میں شاذلی اور بعد میں نقشبندیہ سلسلہ میں سلوک کی منازل طے کیں یہاں تک کہ وہ صاحبِ کرامات بن گئے۔ ڈاکٹر ابراہیم احمد العدوی نے اپنی کتاب 'رشید رضا الامام المجاھد' میں ان کی کئی ایک کرامات کا تذکرہ کیا ہے۔ آخر عمر میں وہ تصوف میں ذکر واذکار کے مروّج طور طریقوں اور کشف وغیرہ کو بدعت قرار دیتے تھے اور سلفیت کی طرف مائل ہوگئے تھے اور اپنے شیخ اور مربّی حسین الجسر پر اپنے رسالے میں رد بھی شائع کیا۔ رشید رضا ایک پرجوش داعی اور مبلغ بھی تھے۔ مساجد میں دروس کا اہتمام کرتے تھے اور قہوہ خانوں میں جا کر لوگوں کو تبلیغ کرتے تھے۔ اسی طرح گاؤں کی عورتوں کی دینی تعلیم کے لیے بھی فقہی مسائل کے حلقے قائم کرتے تھے۔ قبر پرستی کے خلاف تھے اور قبروں سے تبرک لینے سے شدّت سے منع کرتے تھے۔ اسی طرح ان درختوں کو کاٹنے کا حکم دیتے تھے جن سے عامۃ الناس تبرک حاصل کرتے تھے۔

اسی دوران سید جمال الدین افغانی اور مفتی محمد عبدہٗ کے رسالے 'العُروۃ الوُثقیٰ' کے کچھ شمارے ان کے ہاتھ لگے جن سے وہ اس قدر متاثر ہوئے کہ بقیہ زندگی انہی کی صحبت میں گزار دی۔ ۱۳۱۴ھ میں سید جمال الدین افغانی کی وفات کے بعد ان کے علمی وارث مفتی محمد عبدہٗ سے استفادہ کے لیے مصر منتقل ہو گئے۔ ۱۳۱۵ھ میں رشید رضا کی مصر آمد ہوئی اور انہوں نے اپنے استاذ مفتی محمد عبدہٗ سے قرآن کی تفسیر کا مطالبہ کیا تو ان کی اس خواہش پر محرم ۱۳۱۷ھ میں مفتی محمد عبدہٗ نے قرآن کی تفسیر کی ابتدا کی' جس کا بیان محرم ۱۳۲۳ھ تک جاری رہا اور اس دوران انہوں نے سورۃ النساء کی آیت ۱۲۵ تک تفسیر مکمل کی۔ استاذ کی وفات کے بعد رشید رضا نے اس تفسیر کو مکمل کرنے کی کوشش کی اور انہوں نے یہ تفسیر سورۂ یوسف کی آیت ۱۰۱ تک مکمل کی۔ رشید رضا نے لکھا ہے کہ انہوں نے اس تفسیر کی تکمیل اپنے استاذ کے منہج سے ہٹ کر کی ہے اور آیات کی تفسیر میں مروی صحیح روایات کو کثرت سے بیان کیا ہے' علماء کے اختلافات کا بھی تذکرہ کیا ہے اور مفرداتِ قرآن کی بھی لغوی تحقیقات پیش کی ہیں۔ سورۂ یوسف کے بعد اس تفسیر کی تکمیل استاذ بہجت بیطار نے کی ہے۔ انہوں نے 'المنار' کے نام سے شوال ۱۳۱۵ھ بمطابق ۱۸۹۸ء ایک رسالہ بھی جاری کیا۔ اس کا آخری شمارہ ربیع الثانی



۱۳۵۴ھ بمطابق ۱۹۳۵ء شائع ہوا۔ ان کا یہ رسالہ عالمِ عربی کے علاوہ عالمِ اسلام اور یورپ کے علمی حلقوں میں بھی بہت معروف ہوا۔ اس رسالہ میں وہ اپنے اور اپنے استاذ مفتی محمد عبدہ کے افکار شائع کرتے تھے۔ اس رسالہ کو انہوں نے بدعات کے خاتمے اور مسلمانوں کی تعلیم و تربیت کا ذریعہ بھی بنایا۔ ۱۳۳۰ھ میں 'معھد الدعوۃ والارشاد' کے نام سے ایک ادارہ بنایا جس میں تین سالہ تربیتی کورس کے بعد طلبہ کو 'مرشد' کا سرٹیفکیٹ دیا جاتا تھا اور انہیں مسلمانوں کی تربیت کی اجازت دے دی جاتی تھی۔ اگر کوئی طالب علم تین سال مزید تربیت لیتا تو اسے غیر مسلموں میں بھی دعوت کی اجازت دے دی جاتی تھی۔ اپنے وقت میں اس مدرسے نے بڑے بڑے داعی پیدا کیے۔ اپنے استاذ کے نقش قدم پر چلتے ہوئے جامعہ ازہر کی اصلاح کے لیے بھی لکھتے رہے۔ اپنے استاذ کی زندگی میں رشید رضا نے سیاست میں کچھ لکھا یا لکھنے کا ارادہ کیا تو مفتی محمد عبدہٗ نے اس کی شدت سے مخالفت کی' کیونکہ وہ سیاست کے ذریعے اصلاح کے نقطہ نظر کو صحیح نہیں سمجھتے تھے' البتہ استاذ کی وفات کے بعد رشید رضا سیاست کے میدان میں کھل کر سامنے آگئے اور سلطنت عثمانیہ پر کڑی نقد کی۔ ۱۳ جمادی الأولیٰ ۱۳۵۴ھ بمطابق ۱۹۳۵ء ان کی وفات ہوئی اور اپنے استاذ مفتی محمد عبدہٗ کے ساتھ دفن کیے گئے۔

## کتب کا تعارف

رشید رضا نے اپنی زندگی میں بہت کچھ لکھا۔ ۱) ان کی معروف کتابوں میں 'الحکمۃ الشرعیۃ فی محاکمۃ القادریۃ والرفاعیۃ' نامی کتاب ہے اور یہ ان کی اولین تصنیف ہے۔ ۲) مجلّہ 'المنار' جس کا تذکرہ پہلے گزر چکا ہے۔ ۳) تاریخ الأستاذ الإمام محمد عبدہ۔ ٤) الوحی المحمدی۔ ٥) 'المنار والأزھر۔ اس کتاب میں انہوں نے ازہر کے ساتھ اپنے اختلافات کا تذکرہ کیا ہے۔ ٦) ذکر المولد النبوی۔ ۷ و ۸) یسر الإسلام۔ ۹) الخلافۃ۔ ۱۰) الوھابیون والحجاز۔ ۱۱) السنۃ والشیعۃ۔ ۱۲) مناسك الحج۔ ۱۳) تفسیر المنار۔ ١٤) الربا و المعاملات فی الإسلام۔ ١٥) مساواۃ الرجل بالمرأۃ۔ ١٦) رسالۃ فی أبی حامد الغزالی۔ ١٧) المقصورۃ الرشیدیۃ۔ ١٨) شبھات النصاریٰ وحجج الإسلام۔ ١٩) خلاصۃ السیرۃ المحمدیۃ۔ ٢٠) انجیل برنابا۔ ٢١) المسلمون والقبط۔ ٢٢) عقیدۃ الصلب والفداء۔ ٢٣) محاورات المصلح والمقلد۔ ٢٤) فتاوی السید رشید رضا وغیرہ

## افکار و نظریات

رشید رضا نے اپنے رسالے کی اشاعت کے لیے اپنا مطبع بھی قائم کیا تھا۔ بعد ازاں اس

مطبع سے انہوں نے سلف صالحین کی کتابیں شائع کرنی شروع کیں۔ امام ابن تیمیہ، امام ابن قیم اور شیخ محمد بن عبدالوہاب رحمۃ اللہ علیہم کی کتب کو انہوں نے خاص طور پر شائع کیا جس کی وجہ سے ان کے مخالفین نے انہیں وہابی کہنا شروع کر دیا۔ رشید رضا، شیخ محمد بن عبدالوہاب کے سلفی عقیدے کا حد درجے دفاع اور تبلیغ کرتے تھے۔ اپنی کتاب 'السُّنّة والشيعة' میں انہوں نے شیخ محمد بن عبدالوہاب کی تحریک پر اہل تشیع کے اعتراضات کا جواب دیا ہے۔ اپنی کتاب 'الوهابيون والحجاز' میں انہوں نے کئی ایک مقالات کی صورت میں شیخ محمد بن عبدالوہاب کے مخالفین کے اعتراضات کے جواب دیے ہیں۔ مفتی محمد عبدہٗ کے بعض دوسرے شاگردوں مثلاً استاذ محمد حسین ہیکل، شیخ عبدالعزیز جاویش اور استاذ محمد فرید وجدی نے ان کے خلاف یہ محاذ کھول دیا کہ یہ اپنے شیخ مفتی محمد عبدہٗ کے منہج سے منحرف ہو گئے ہیں اور ان کے خلاف کئی ایک رسالے جاری کیے۔ انہوں نے اپنے اساتذہ کی طرح تحریک ماسونیت میں شرکت اختیار نہیں کی بلکہ اس کی رکنیت سے منع کرتے تھے۔ خلافتِ عثمانیہ کے ادارے کے خاتمے کے بعد انہوں نے خلافت کی بحالی کے لیے 'الخلافة أو الإمامة العظمٰى' کے نام سے کتاب لکھی اور خلافت ختم کرنے کی وجہ سے مصطفیٰ کمال پاشا کو ملحد قرار دیا۔

محمد رشید رضا کے صوفیت سے سلفیت کی جانب اس ذہنی ارتقاء اور سفر کے باوجود بعض سلفی علماء کا یہ کہنا ہے کہ ان میں سید جمال الدین افغانی اور مفتی محمد عبدہٗ کی فکر کے کچھ اثرات ان کی وفات تک باقی رہے۔ ان کا بھی اپنے استاذ مفتی محمد عبدہٗ کی طرح یہی موقف تھا کہ اگر قطعی عقلی دلیل اور نقلی دلیل (یعنی قرآن وسنت) میں تعارض ہو جائے تو عقل کو ترجیح ہوگی اور نقل کی کوئی ایسی تاویل کریں گے کہ وہ عقل کے مطابق ہو جائے۔ سورۃ الانفال کی آیت ۹ ﴿اِذْ تَسْتَغِيْثُوْنَ رَبَّكُمْ فَاسْتَجَابَ لَكُمْ اَنِّيْ مُمِدُّكُمْ بِاَلْفٍ مِّنَ الْمَلٰٓئِكَةِ مُرْدِفِيْنَ ۝۹﴾ کی تفسیر میں لکھتے ہیں کہ غزوۂ بدر کے موقع پر فرشتوں کے نزول سے مراد اس کا ظاہری معنیٰ نہیں ہے کہ باقاعدہ کوئی فرشتے آسمان سے نازل ہوئے تھے اور انہوں نے کوئی جنگ بھی لڑی تھی، بلکہ اس سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کے دلوں میں اطمینان اور سکون پیدا کر دیا تھا۔ سورۃ البقرۃ کی آیت ۶۵ ﴿فَقُلْنَا لَهُمْ كُوْنُوْا قِرَدَةً خٰسِئِيْنَ ۝۶۵﴾ کی تفسیر میں لکھتے ہیں کہ اس سے مراد یہ نہیں ہے کہ بنی اسرائیل کی اس جماعت کو واقعتاً بندر بنا دیا گیا تھا بلکہ اس سے مراد انہیں بندروں کے ساتھ تشبیہ دینا ہے۔

امام مہدی کی روایات کو ضعیف اور موضوع قرار دیتے ہوئے ان کی شخصیت یا آمد کا



انکار کیا ہے۔ اسی طرح قیامت کی نشانیوں میں سے مغرب سے سورج کے طلوع ہونے پر عقلی اعتراضات وارد کیے ہیں اور اس بارے میں صحیح بخاری میں وارد روایت میں تشکیک پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔ انشقاقِ قمر کے معجزۂ نبویہ کا انکار کیا ہے، کیونکہ ان کے بقول یہ واقعہ خلافِ عقل ہے اور اخبار آحاد سے مروی ہے لہٰذا ناقابل قبول ہے۔ جنّات کے بارے ان کا کہنا ہے کہ ان کے وجود سے انکار تو ممکن نہیں ہے لیکن ان سے مراد وہ بیکٹیریا یا جراثیم ہو سکتے ہیں جو انسانی خون میں دوڑتے پھرتے ہیں اور نظر نہیں آتے۔ سورۃ البقرۃ کی آیت ۲۷۵ ﴿وَمَنْ عَادَ فَاُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ۝۲۷۵﴾ کی تفسیر میں لکھا ہے کہ اس حکم کے جاری ہونے کے بعد بھی جو شخص سود کھائے گا تو وہ دائمی جہنمی ہے۔ یعنی آیت کو معتزلہ کے مذہب کے مطابق اس کے ظاہری مفہوم پر باقی رکھا ہے۔ مجلّہ 'المنار' کی جلد ۲۸ کے جزء ۱۰ میں جسم وروح کے ساتھ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے رفعِ سماوی اور نزولِ مسیح کے عقیدہ کا انکار کیا ہے اور کہا ہے کہ یہ درحقیقت عیسائیوں کا عقیدہ ہے۔

## خلاصۂ کلام

مفتی محمد عبدہٗ کی نیت اور خلوص پر تو کوئی شک نہیں ہو سکتا لیکن ان کی تفسیر اور افکار کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان پر عقلیّت (rationalism) اور اعتزال کا حد درجے غلبہ ہے۔ مفتی محمد عبدہ کی مثال ہم برصغیر میں اعتزالِ جدید کی تحریک کے رہنما جناب سرسید احمد خان سے دے سکتے ہیں، جنہوں نے اپنے اخلاص کے باوصف دین اسلام اور قرآن وسنّت کی نصوص وتعلیمات کا حلیہ بگاڑ دیا۔ سرسید اور مفتی محمد عبدہٗ کے تقابلی مطالعے سے یہ فرق ان دونوں حضرات میں بہت نمایاں نظر آتا ہے کہ مفتی محمد عبدہٗ کو علومِ دینیہ میں جو رسوخ حاصل تھا وہ سرسید کے حصے میں نہیں آیا تھا، لہٰذا یہی وجہ ہے کہ قرآن کے بعض مقامات پر جہاں سرسید بھٹک گئے وہاں مفتی محمد عبدہٗ ہمیں اہلِ سنت اور سلف صالحین کے ساتھ کھڑے نظر آتے ہیں، جیسا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے عصا سے سمندر کے پھٹ جانے کے معجزہ کے اقرار یا انکار کا معاملہ ہے۔ عقل پرستی کی بنیاد پر فکری بگاڑ اور انحراف دونوں حضرات میں موجود ہے لیکن سرسید تو اس مسئلے میں کسی ضابطے کے پابند نہیں ہیں جبکہ مفتی محمد عبدہ بعض مقامات پر عقل کے بالمقابل نقل کو ترجیح دیتے ہیں اور اس کی من گھڑت تاویلات میں نہیں پڑتے۔ پس ہم کہہ سکتے ہیں کہ مفتی محمد عبدہٗ کے ہاں گمراہی اس درجے کی نہیں جو سرسید کے ہاں پائی جاتی ہے۔

جہاں تک ان کے حج نہ کرنے کا معاملہ ہے تو یہ ایک بہت بڑی کوتاہی ہے۔ بعض حضرات نے ان کے نماز نہ پڑھنے کو نقل کیا ہے اور اس نقل کا انداز بھی کچھ یوں ہے کہ کوئی صاحب ان کے ساتھ کسی مجلس میں موجود تھے تو نماز کا وقت آنے پر انہوں نے نماز نہ پڑھی یہاں تک کہ اگلی نماز کا وقت ہو گیا اور اس واقعے کو ان صاحب نے آگے نقل کر دیا۔ اس قسم کے واقعات میں ہمارے خیال میں یہ توجیہہ کی جا سکتی ہے کہ انہوں نے دو نمازیں جمع کر لی ہوں گی۔ جس شخص کے افکار میں اس قدر آزادی اور حریت فکر موجود ہو تو اس سے یہ بعید از قیاس نہیں ہے کہ وہ بلا عذرِ شرعی بھی دو نمازیں جمع کرنے کا قائل ہو۔ واللہ اعلم بالصواب!

شیخ رشید رضا میں البتہ وقت کے ساتھ ساتھ افکار میں بہتری آئی ہے اور بہت سی باتوں میں انہوں نے اپنے استاذ کے منہج کی مخالفت کی ہے۔ اگرچہ ان کے بھی بہت سے افکار ایسے ہیں جو قابل تنقید ہیں اور ان کی تحریروں، بالخصوص تفسیر 'المنار' اور مجلہ 'المنار' کے مطالعہ سے یہ محسوس ہوتا ہے کہ وہ بھی قرآن کی تفسیر میں بہت حد تک عقلیت کی طرف مائل تھے۔ پس ان کا جو کام شرک و بدعت کے رد میں ہے، وہ قابل تعریف ہے اور انہوں نے جو تحقیقات قرآن کی عقلی تشریح و تعبیر میں پیش کی ہیں، وہ قابل مذمت اور گمراہی کے قبیل سے ہیں۔

## مصادر و مراجع


۱) حیات مفتی محمد عبدہ، اقبال اکیڈمی، لاہور، مترجم محمد مظہر الدین صدیقی۔ چارلس ایڈیمس کی کتاب 'Islam and Modernism in Egypt' کے بعض ابواب کا ترجمہ ہے۔

۲) منهج المدرسة العقلية الحديثية في التفسير، فهد بن عبد الرحمن بن سليمان الرومي، إدارات البحوث العلمية والافتاء والدعوة والإرشاد، الرياض۔

۳) الأعمال الكاملة لمفتي محمد عبده، الدكتور محمد عمارة۔

۴) تفسير المنار، شيخ رشيد رضا، الهيئة المصرية العامة۔

۵) رشيد رضا الإمام المجاهد، الدكتور ابراهيم أحمد العدوي، المؤسسة المصرية العامة۔

6- *http://muntada.islamtoday.net/t37043.html*

7- *http://en.wikipedia.org/wiki/Muhammad_Abduh*

8- *http://ar.wikipedia.org/wi ki/%D9%85%D8%AD%D9%85%D8%AF_%D8%B9%D8%A8%D8%AF%D9%87*

9- *http://ar.wikipedia.org/wiki/%D9%85%D8%AD%D9%85%D8%AF_%D8%B1%D8%B4%D9%8A%D8%AF_%D8%B1%D8%B6%D8%A7*

10- *http://www.saaid.net/feraq/el3aedoon/17.htm*

داعیٔ رجوع الی القرآن، بانیٔ تنظیم اسلامی

محترم **ڈاکٹر اسرار احمد** رحمۃ اللہ علیہ

کے شہرۂ آفاق دورۂ ترجمہ قرآن پر مشتمل

# بیانُ القرآن

## ترجمہ و مختصر تفسیر

**حصہ اول** سورۃ الفاتحہ وسورۃ البقرۃ مع تعارف قرآن

صفحات:360، قیمت450روپے

**حصہ دوم** سورۃ آل عمران، سورۃ النساء اور سورۃ المائدہ

صفحات321، قیمت،400روپے

عمدہ طباعت ❁ دیدہ زیب ٹائٹل اور مضبوط جلد ❁ امپورٹڈ پیپر

**ملنے کے پتے**

**انجمن خدام القرآن خیبر پختونخوا، پشاور**

A-18 ناصر مینشن، ریلوے روڈ نمبر2، شعبہ بازار پشاور، فون: 2584824,2214495(091)

**مکتبہ خدام القرآن لاہور**

K-36، ماڈل ٹاؤن لاہور، فون 3-35869501(042)



شعبہ مطبوعات قرآن اکیڈمی لاہور کی تازہ ترین پیشکش

- اسلام کیا ہے؟
- ایمان کی حقیقت کیا ہے؟.....اور
- احسان سے کیا مراد ہے؟

اِن سوالوں کی وضاحت پر مبنی

بانیٔ تنظیم اسلامی **ڈاکٹر اسرار احمد** رحمۃ اللہ علیہ

کے چار خطابات جمعہ پر مشتمل کتاب

# "اسلام، ایمان اور احسان"

## حدیثِ جبریلؑ کی روشنی میں"

☆عمدہ طباعت ☆دیدہ زیب ٹائٹل ☆صفحات:72 ☆قیمت:50روپے

**مکتبہ خُدّام القُرآن لاہور**

K-36، ماڈل ٹاؤن لاہور۔
فون:3-35869501-042

email: maktaba@tanzeem.org